بیجاپور کا ایک صوفی شاعر

# شاہ معظم



ڈاکٹر حسینی شاہد



انجمن ترقی اردو، آندھرا پردیش
حیدرآباد

QASID KITAB GHAR
Mohammad Hanif Razvi Nagarchi
Near Jamia Masjid, Arcot Dargah,
BIJAPUR-586104, (Karnataka)

بیجاپور کا ایک صوفی شاعر

# شاہ معظم

محمد حنیف رضوی نگارچی
بیجاپور

ڈاکٹر حسینی شاہد

انجمن ترقی اردو، آندھرا پردیش

حیدرآباد



تحریک فکر اہل سنت

Tahreeke Fikre Ahlesunnat

اشاعت — ڈسمبر ۱۹۷۸ء

مطبع — دائرہ پریس، چھتہ بازار،

خوش نویس — محمد عارف الدین

ناشر — انجمن ترقیِ اردو آندھرا پردیش

قیمت — [illegible]





ملنے کا پتا:

انجمن ترقیِ اردو آندھرا پردیش، حمایت نگر، حیدرآباد

اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش

اِلیاس ٹریڈرز، شاہ علی بنڈہ روڈ

انجمن ترقیِ اردو، ہند، راوز اوینو، نئی دہلی

مکتبۂ جامعہ، اردو بازار، نئی دہلی

مکتبۂ جامعہ، شمشاد مارکٹ، علی گڑھ۔




# فہرس

یہ کتاب اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش کی مالی اعانت سے شائع کی جا رہی ہے

## مصنف کی دوسری کتابیں

امر جیون

سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ ـــــ حیات اور کارنامے

زیر طبع :

اُردو نثر کا پہلا مستند نقش

میراں جی خدانما

شاہ محمد قادری نُوردریا

سید ہاشم خداوند ہادی

متروک اصناف سخن

**QASID KITAB GHAR**
Mohammad Hanif Razvi Nagarchi
Near Jamia Masjid, Arcot Dargah,
BIJAPUR-586104, (Karnataka)



شاہ معظم، علی عادل شاہ ثانی شاہی ( ۱۰۶۷ - ۱۰۸۳ ہجری ) کے دور کے ایک صوفی شاعر تھے۔ انھوں نے سکندر عادل شاہ (۱۰۸۳ - ۱۰۹۷ ہجری) اور اورنگ زیب کا زمانہ ( - ۱۱۱۸ ہجری ) بھی دیکھا ہے۔ عادل شاہی سلطنت نے ان کی نظروں کے سامنے آخری ہچکی لی اور دارالسرور بیجاپور کا سہاگ لٹ گیا۔ نصرتی کے الفاظ میں 'بدو بد جنس' کے منصوبے کامیاب ہوئے اور علم و فن، تہذیب و شائستگی، دکھنی زبان و ادب اور ہندلمانیت کے ایک عظیم مرکز کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ شاہ معظم اس المیے پر آنسو بہانے کے لیے زندہ رہے اور جب تک زندہ رہے، شاہ پور کے تصنیفی فیضان کو عام کرتے رہے۔

شاہ معظم، شعرائے حلقۂ امینیہ کے گل سرسبد ہیں۔ اُنھوں نے دیوانِ غزلیات کے علاوہ، متعدد مثنویاں اور متفرق کلام، جن میں منقبت، مدح، قصاید وغیرہ شامل ہیں، یادگار چھوڑا ہے۔ اُن کی مثنویوں اور دیوان کے نسخے کتب خانوں اور خانگی ذخیروں میں عام طور پر مل جاتے ہیں، جس سے اُن کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے، لیکن تعجب ہے کہ اس کے باوجود اُن کے حالات اور خاندان کے بارے میں ہم تک کوئی معلومات نہیں پہنچ سکی ہیں۔ یہاں تک کہ ہم اُن کے پورے نام سے بھی واقف

نہ تھے، صرف تخلص سے متعارف تھے۔

شاہ معظم کے کلام کے تفصیلی مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ معظم اُن کا لقب ہے اور عطائے پیر:

خود قادر پیار کیا ہے ٭ مجہ رویت آپ دیا ہے
مجہ راکھا ناوٗں معظم ٭ اور اپنا کیتا محرم

(مفتاح الاسرار)

میرا معظم ناوٗں رکھ، عالم پو یوں ظاہر کیا
قادر بڑا داتار ہے پھر کیا کرے گا دیکھنا

(دیوان)

قادر ہے نام شہ کا، کیا اسم ہے مسمّیٰ
کر مجھ کو پنج ہزاری معظم دیا لقب

(دیوان)

کہیں کہیں وہ اپنے آپ کو سلطان معظم بھی کہتے ہیں:

یو نامہ کیا کر مجھے حق دیا ٭ مجھ عاجز کو سلطان معظم کیا

(معراج نامہ)

اپ تاج فقر کا دیتا ٭ اور سلطان معظم کیتا

(مفتاح الاسرار)

غالباً ان کا پورا لقب سلطان معظم ہے۔

شاہ معظم کی شرحِ شکار نامہ کا ایک نسخہ کتب خانۂ آصفیہ میں محفوظ ہے۔ جس سے پتا چلتا ہے کہ: ان کا نام محمد حسینی ہے، وہ قادری تھے، چشتیہ گھرانے



میں طالب ہوئے اور حضرت امین کے تربیت یافتہ تھے۔

اس شکار نامے کی شرح نفیر محمد حسینی معظم قادری اپنے حوصلے موافق فرمائے ہیں، اس واسطے کے یو عاجز اس گھر چشت میں طالب ہوا ہے، ہور امین الدین علی خود کوں سجدہ کیا ہے، اون کے تصدق سوں یو نفیر اس راز کوں پونچا ہے۔[۱]

اپنی نسبتِ قادریہ کی طرف انھوں نے گلزارِ چشت میں بھی اشارہ کیا ہے:

معظم کتے قادری ہے فقیر ٭ گناہ گار، عاجز، فقیر و حقیر

لیکن یہ پتا نہیں چلتا کہ خانوادۂ قادریہ میں وہ کس سے بیعت تھے۔ اس بارے میں: تو خود انھوں نے کچھ کہا ہے اور نہ کوئی داخلی یا خارجی شہادت ہی ایسی ملی ہے، جس کی بنیاد پر ہم کوئی رائے قائم کرسکیں۔ البتہ چشتیہ گھرانے میں بیعت اور اپنے پیر اور دادا پیر کا ذکر واضح الفاظ میں کئی جگہ کیا گیا ہے، لیکن اس کے باوجود اہلِ تحقیق کے بیانات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعضوں نے اُنھیں حضرت امین الدین علی اعلیٰ[۲] کا اور بعضوں نے حضرت امین کے خلیفہ حضرت عبدالقادر لنگ بند[۳] (قادر لنگا) کا مرید/شاگرد بتایا ہے۔[۴] بعضوں کے بیانات متناقض اور متضاد ہیں[۵]

۱۔ مخطوطہ نمبر (۱۱۴۲ جدید) کتب خانۂ آصفیہ، حیدرآباد

۲۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، اردو نثر کا آغاز اور ارتقا، صفحہ ۱۹۲۔ ابو نصر خالدی، قدیم اردو، جلد اول، صفحہ ۲۲۲

۳۔ سخاوت مرزا، تاریخ ادب اردو، جلد اول، صفحہ ۴۲۸

۴۔ ڈاکٹر زور، فہرست مخطوطات ادارۂ ادبیات اردو، جلد اول، صفحہ ۱۴۸ اور صفحہ ۲۶۵، دکنی ادب کی تاریخ، صفحہ ۶۰

نصیر الدین ہاشمی، کتب خانۂ نواب سالار جنگ کی اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست صفحہ ۱۹۹، اور صفحہ ۳۸۴، فہرست مخطوطات کتب خانۂ آصفیہ، جلد دوم، صفحہ ۲۹۰۔ دکن میں اردو چھٹی اشاعت، صفحہ ۲۴۹، علی گڑھ تاریخ ادب اردو صفحہ ۳۲۱

ابو نصر خالدی صاحب نے قیاس آرائی کی ہے کہ "۔۔۔۔ شاہ معظم کے مرشدِ بیعت تو امین الدین اعلیٰ ہی تھے اور قادر مرشد تربیت، جنھوں نے امین الدین کے حکم پر معظم کے مراتبِ سلوک و مدارجِ معرفت اپنی نگرانی میں طے کرائے۔[1]

حقیقت اس کے برعکس ہے۔

شاہ معظم، حضرت قادر لنگا کے مرید تھے اور اپنے پیر سے دیوانہ وار عقیدت رکھتے تھے۔ انھوں نے کم و بیش ہر مثنوی اور نظم میں بلکہ ہر غزل کے مقطعے میں اپنے پیر کا ذکر کیا ہے اور بڑے مان سے کیا ہے۔ بعض غزلوں اور ریختیوں میں تو وہ والہانہ شیفتگی، ربودگی اور سپردگی ملتی ہے، جو صرف مجاز کے لیے مخصوص سمجھی جاتی ہے۔

ہوا تر لوک پر غوغا کہ ثانی آئیا یوسف
نویلا لال قادر شاہ صورت لے سب پیمبر کا
(قصیدہ)

مجہ عقل کہتی اٹھ معظم کام کر ؛ اور عشق کہتا قادر ہے مل آرام کر
(گفتار)

وہ قادر الو کا تو ساقی کتے ؛ پلاتا ہے مے بھر کے باقی کتے
(آزاد نامہ)

بزرگی اسمِ اعظم کی کیا قران میں لیکن
معظم کو ورد کرنے سو قادر نام خوش لگتا
(دیوان)

ادبادشاہِ خوباں قادر ہے نام اوس کا ؛ خلعت عطا کرے گا سن کر کلام میرا
(دیوان)

---

[1] ابو نصر خالدی، قدیم اردو، جلد اول، صفحہ ۲۲۷



دل برسوں مل معظم عشرت مدام کر تو ؛ قادر ترا سنگاتی تیرے سنگات ہے لگ
(دیوان)

ایک شعر میں صاف الفاظ میں اپنے پیر کا نام قادر بتایا ہے:

مجہ کوں مدد ہے پیر کا جس نام ہے قادر کتے
تب یو معظم جگ منے مشہور یوں اظہر ہوا
(دیوان)

شاہ معظم نے اپنی روحانی سرگذشت مفتاح الاسرار میں بیان کی ہے۔ جو غالباً ابو نصر خالدی اور دوسرے محققین کی نظر سے نہیں گزری۔ اس مثنوی میں معظم نے بتایا ہے کہ حکمِ نبی کی متابعت میں وہ حضرت امین کے طالب ہوے:

اب جا تو بیجا پور ؛ ہے پور وہاں شہ پور
وہاں امین علی ہے پیر ؛ ہے روشن دیکھ ضمیر
اب ہونا جا کر طالب ؛ گر عشق تجھے ہے غالب
میں کیتا امر قبول ؛ جوں بولے نبی رسول

حضرت امین نے اوامر و نواہی سے واقف اور اسرار و رموز سے باخبر کرانے کے بعد شاہ معظم سے کہا کہ تیرا پیر تو قادر ہے، تو اُس کو اپنے دل میں بسا لے اور اس کا دامن تھام لے:

ہے پیر ترا تو قادر ؛ او حاضر ہے تو ناظر
اوس پیر کو ناہیں بسر تو ؛ اور اس کو دل میں دھر تو

اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ شاہ معظم کے پیر قادر لنگا تھے اور انھوں نے اپنے دادا پیر یعنی حضرت امین الدین علی اعلیٰ سے بھی کسب فیض کیا ہے۔

شاہ معظم نے حضرت امین، اُن کے بیٹے بابا شاہ حسینی اور پوتے علی پیر کا ابتدائی زمانہ دیکھا ہے۔ شجرۃ الاتقیا انھوں نے علی پیر کے زمانۂ سجادگی ہی میں لکھی

تھی۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ وہ بارھویں صدی کے دوسرے بلکہ تیسرے دہے کے
اوائل میں بقیدِ حیات تھے۔

نصیر الدین ہاشمی کا بیان ہے کہ شاہ معظمؒ امین الدین اعلیٰ کے مرید اور خلیفہ تھے۔[1]
لیکن کسی ذریعے سے اس کی توثیق نہیں ہوتی کہ انھیں قادر لنگا یا حضرت امین سے خلافت
حاصل تھی۔ یہ ضرور ہے کہ ان کے علمی تبحر اور کمالِ فن کے پیشِ نظر قیاس کہتا ہے کہ
انھیں خلافت حاصل ہوگی، لیکن محض قیاس کی بنیاد پر کوئی نتیجہ اخذ کرنا تحقیقی احتیاط کے
منافی ہے۔ تاہم اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ جہاں تک فیضانِ تصنیف
کا تعلق ہے، وہ حضرت امین کے حلقۂ ارادت میں امتیازی مقام رکھتے ہیں، بلکہ یہ کہا
جاسکتا ہے کہ حلقۂ امینیہ کے تصنیف و تالیف کے کارناموں کا کوئی تذکرہ اس وقت
تک مکمل نہیں ہوسکتا جب تک کہ شاہ معظم کی خدمات کا اعتراف نہ کیا جائے۔

---

[1] نصیر الدین ہاشمی، فہرست مخطوطات کتب خانۂ آصفیہ، جلد دوم، صفحہ ۲۹۰۔



# قصیدہ

شاہ معظم کا یہ قصیدہ اُن کے دیوان کے علاوہ کتب خانۂ نواب سالار جنگ کے اُس
مجموعے (۱۴۹ تصوف) میں بھی ملتا ہے، جو آزاد نامے، الف نامے (شاہ معظم)
اور وصیت الہادی (شاہ برہان الدین جانم) پر مشتمل ہے۔ انھیں دو نسخوں کا مقابلہ کر کے
ابو نصر خالدی صاحب نے اس کا متن رسالۂ قدیم اردو، جلد اول، میں شائع کیا تھا۔

مجموعۂ رسائل (۱۴۹ تصوف) میں پہلے آزاد نامہ ہے اور اس کے بعد زیرِ تبصرہ قصیدہ
جو دو صفحات اور اکیس ابیات پر مشتمل ہے۔ قصیدہ، سرخ روشنائی سے لکھا ہے۔
کوئی ترقیمہ نہیں ہے۔

دیوان میں یہ قصیدہ ردیف الف کی غزلوں میں شامل ہے اور غزل کی سرخی کے
تحت لکھا گیا ہے۔ تعداد اشعار بائیس ہے۔

خالدی صاحب نے اس قصیدے کے تمہیدی نوٹ میں جو کچھ لکھا ہے، وہ اتنا عمومی
ہے کہ اُس کو تصوف کے کسی رسالے سے بھی متعلق کیا جاسکتا ہے۔ اس عمومیت کی وجہ
سوائے اس کے کچھ سمجھ میں نہیں آتی کہ خالدی صاحب نے اُن اصطلاحات کو سمجھنے اور
سمجھانے کی ضرورت اور اہمیت محسوس نہیں کی، جو اس قصیدے میں استعمال ہوئی ہیں
چناں چہ وہ لکھتے ہیں:

"راقم الحروف کا خیال ہے کہ اس قصیدے کے موجودہ قاریوں میں شاید ہی کوئی ایسے بزرگ نکلیں جو تصوف کو اس کے ذریعے سمجھنا چاہیں۔ اس حسنِ ظن یا سوءِ ظن کی وجہ سے قصیدے میں آئی ہوئی اصطلاحوں کی تشریح ضروری نہیں معلوم ہوتی۔ جہاں جہاں قرآنی آیتوں کا ذکر آیا ہے، اُن کے مکمل حوالے درج کر دیے گئے ہیں اور اگر بہ فرضِ محال کسی صاحب کو اس قصیدے میں بیان شدہ تصوف سے دلچسپی ہو اور وہ اس میں آئی ہوئی اصطلاحوں کے معنے متعین کرنا چاہیں تو وہ معظم سے قریب تر زمانے کے ایک بزرگ محمد حیات متوفی بارہ سو اکاسی ہجری کے رسالوں سے رجوع کر سکتے ہیں جو اردو (دکھنی) میں لکھے گئے ہیں۔ اُن کے بائیس رسالے مصباح الحیات کے نام سے کئی مرتبہ چھپے ہیں۔[1]

دکھنی تصوّف کے رسائل ہمارے ہاں درس و تدریس کے کام آتے رہے ہیں۔ مثلاً من لگن ایک گھرانے میں داخلِ نصاب تھی اور اس کو سبقاً سبقاً پڑھا اور پڑھایا جاتا رہا ہے۔ اس لیے اگر کوئی شاہ معظم یا اُن کے سلسلے کے بزرگوں کی تصانیف سے تصوف سیکھنا چاہے تو یہ حیرت کی بات نہیں ہوگی۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ خانوادۂ امینیہ کے تصوف کا جائزہ لیا جائے تو ہندلمانیت کی اس عہد آفریں تحریک کے بڑے ہی معنی خیز، دل چسپ اور گہرے نقش اجاگر ہوں گے جو مسلمانوں کے ہندوستان میں بس جانے کے بعد شروع ہوئی اور جس نے ہندستان کے ذہن اور اس کی تہذیب ہی کا نقشا نہیں بدلا بلکہ مذہب کے اعلیٰ تصورات کو بھی متاثر کیا۔ یہ اثر اندازی اور اثر پذیری دو طرفہ تھی۔ اس لیے اس دبستانِ تصوف کا مطالعہ دکھنی زبان اور ادب کے طالب علموں کے لیے ہی نہیں بلکہ اُن لوگوں کے لیے بھی ضروری ہے جو قرونِ وسطیٰ میں ہندستانی فکر اور

[1] ابو نصر خالدی، قصیدہ، قدیم اردو، جلد اول، ۱۹۶۵ء



تہذیب کی تاریخ سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

دکھنی ادب کے محققین صوفیانہ ادب کا مطالعہ اس کی لسانی اہمیت کے پیش نظر کرتے ہیں۔ اس لیے اگر اصطلاحوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو پھر کرم خوردہ رسائل کے مطالعے اور اُن کو مرتب کرنے کے لیے آنکھیں پھوڑنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہ جاتی۔

عجیب بات ہے کہ خالدی صاحب نے قرآنی آیتوں کے مکمل حوالوں کو درج کرنا تو ضروری سمجھا، لیکن تصوف کی اصطلاحوں کو نظر انداز کر گئے۔ اگر موجودہ قاریوں میں کوئی بزرگ ان رسائل کے ذریعے تصوف سیکھنا نہیں چاہتے تو کون بزرگ اس رسالے میں نقل کی گئی آیات کی قرآن کے متن سے مطابقت و تصدیق کی ضرورت محسوس کریں گے۔ اس لیے جس دلیل کی بنیاد پر انھوں نے اصطلاحات کی تشریح کو غیر ضروری بتایا ہے، اسی دلیل کی بنیاد پر قرآنی آیات کے حوالوں کو بھی غیر ضروری زحمت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ خاص کر ایسی صورت میں جب کہ قرآنی آیات کے حوالے تو آسانی سے مل جاتے ہیں لیکن ان اصطلاحات کی تشریح کہیں نہیں ملتی جو معظم اور ان کے سلسلے کے دوسرے بزرگوں نے استعمال کی ہیں۔ اس لیے قرآنی آیات کے حوالوں سے زیادہ ان اصطلاحات کی وضاحت کی ضرورت تھی، بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ان کی وضاحت کے بغیر دکھنی تصوف کے کسی رسالے کا مرتب کرنا بے معنی ہوگا۔

خالدی صاحب نے اُن بزرگوں کو جو "بہ فرضِ محال" معظم کی اصطلاحوں کے معنے متعین کرنا چاہتے ہیں، محمد حیات کے مجموعہ رسائل، مصباح الحیات کے مطالعے کا مشورہ دیا ہے۔ یہ مجموعہ بائیس رسائل اور ۷۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ایک رسالہ آبِ حیات کے نام سے ملتا ہے، جس میں حروف تہجی کی ترتیب سے اصطلاحاتِ تصوف کی تشریح کی گئی ہے۔[1] خالدی صاحب نے غالباً اسی رسالے سے استفادے کا مشورہ دیا ہے۔

[1] راقم الحروف کے پیشِ نظر مصباح الحیات کا وہ اڈیشن ہے جو ہمدرد بک ڈپو، نیو مارکٹ، بنگلور سے شائع ہوا ہے۔

لیکن خانوادۂ امینیہ کی مخصوص اصطلاحوں میں سے کوئی اصطلاح نہ تو اس رسالے میں ملتی ہے اور نہ دوسرے رسائل میں۔

بہرحال عجیب و غریب تاویلات کر کے خالدی صاحب نے اصطلاحات سے پیچھا چھڑایا ہے اور گنجِ مخفی (آزاد نامے) کے خاتمے پر جو چند اصطلاحوں کو کھولنے کی کوشش کی ہے تو ان کی حیثیت ایجادِ بندہ کی ہو گئی ہے۔ مثلاً: چار وجودوں، سات مستیوں، چھ غفلتوں، پانچ جوہروں۔ پانچ موذیوں کی جو تشریح انھوں نے کی ہے، معظم کے تصوف سے اس کا کوئی علاقہ نہیں ہے۔

خالدی صاحب کی رائے میں قصیدے کی نمایاں خصوصیت، اس کا ایجاز، اختصار اور جامعیت ہے، لیکن اس ایجاز و اختصار کا یہ حال ہے کہ معظم نے کسی مرتبے کا نام لیا ہے، نہ اُن کے موکل، روح، قلب، نفس، فہم، توحید، راہ، ذکر اور منزل کی طرف اشارہ کیا ہے۔ نہ اسرار و رموز، کیفیات و واردات بیان کیے ہیں، نہ عروج و نزول سمجھایا ہے۔ صرف تنوں (وجودوں) مقاموں اور منزلوں کی تعداد گنا دی ہے اور مراتب کے ذکر کے بغیر سالک کے وہ نام بتا دیے ہیں جو اُسے ہر مرتبے میں بہ اعتبارِ حال حاصل ہوتے ہیں۔ اسی طرح نفس، دل، روح، سر، نور اور ذات کی اصطلاحوں کو ایک ہی سانس میں گنا دیا ہے۔

حضرت امین واجب تن کے ضمن میں پانچ عناصر، پچیس گن اور اُن کے لوازمات کی تشریح کرتے ہیں اور اسی ضمن میں انسان کی صفاتِ ستودہ اور صفاتِ مذمومہ اور بعض دوسری چیزوں کو کبھی تشبیہ اور استعارے کے انداز میں اور کبھی سیدھے سادے طریقے پر بیان کرتے ہیں۔ پانچ موذیوں، پانچ لعلوں، پانچ چوروں، سات مستیوں اور چھ غفلتوں کی تفہیم بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ معظم نے نہ تو مرتبے کا ذکر کیا ہے، نہ عناصر اور اُن کے گنوں کا۔ بلکہ موذیوں، غفلتوں اور مستیوں کی طرف اچٹتا سا اشارہ



کیا ہے۔ کچھ اور مسایل بھی اس ضمن میں آگئے ہیں، اُن کی طرف بھی محض اشارے ہیں۔
مختصر یہ کہ شاہ معظم نے اس قصیدے میں اپنے سلوک کا خاکہ پیش کیا ہے اور نہ اس کے شرائط اور لوازم بیان کیے ہیں بلکہ اس کے بعض پہلوؤں کی طرف کسی ربط و تسلسل کے بغیر سرسری اشارے کیے ہیں اور اُن کا تعلق بھی تمام مراتب سے نہیں ہے۔

شاہ معظم اپنی دوسری منظومات میں بھی تعلیمات کی تفصیل نہیں بیان کرتے بلکہ اشاروں اور کنایوں سے کام لیتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ حضرت امین اور اُن کے خانوادے کے بزرگوں نے اپنی تعلیمات کو اس قدر شرح و بسط اور تفصیل و تشریح کے ساتھ بیان کیا ہے کہ معظم نے ان کی تکرار کو غیر ضروری سمجھا ہو۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ معظم کے شاعرانہ شعور نے نظام و نصابِ تصوف کی پیچیدگیوں میں الجھنا، خشک اور غیر دل چسپ تفصیلات میں سرگرداں ہونا اور جزئیات کی اکتا دینے والی تکرار کو گوارا نہ کیا ہو، بلکہ اُن کی طرف سرسری اشارے کر کے اُس کیفیت کی بازآفرینی پر توجہ دی، جو اس پورے نظام کا حاصل ہے۔ اس اہتمام کا نتیجہ اُن کا وہ ایمائی اسلوب ہے جو انھیں اپنے سلسلے کے دوسرے صوفی شاعروں سے ممتاز کرتا ہے، لیکن زیرِ نظر قصیدے میں اس ایمائی اسلوب کی بلاغت اور دل کشی کا بھی فقدان ہے۔ قصیدے کی کل بضاعت بائیس ابیات ہیں اور ان بائیس ابیات میں سلوک بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ پوری نظم اصطلاحات سے بوجھل اور اشارات کی وجہ سے مبہم اور غیر دل چسپ بن کر رہ گئی ہے اور وہی ایجاز و اختصار جو اُن کی دوسری منظومات کا حسن ہے، اس قصیدے میں عیب بن کر بری طرح کھٹکتا ہے۔

ایک اور عیب یہ ہے کہ اشعار میں ربط اور تسلسل ہر جگہ برقرار نہیں رہ سکا ہے، جس کی وجہ سے غزل کا انتشار پیدا ہو گیا ہے۔ اس لیے اس کو قصیدے کی بجائے

غزل کہنا زیادہ مناسب ہے اور دیوان میں ردیف الف کی غزلوں ہی میں شامل ہے،
خالدی صاحب کا خیال ہے کہ:

معظم نے اپنے پیر بھائیوں کے لیے اپنے سلسلے کی تعلیم کا ایک مجمل،
لیکن جامع خلاصہ منظوم کر دیا ہے تاکہ جو لوگ تفصیلات میں پڑے بغیر تعلیم
و طریقۂ تعلیم سے واقف ہونا چاہیں، وہ اس قصیدے پر ایک نظر ڈال لیں
اور راہِ سلوک طے کرنے کا ارادہ کرنے والے مبتدی اس کو حفظ کر لیں۔[1]

جہاں تک حفظ کرنے کی تجویز کا تعلق ہے مبتدی اور منتہی دونوں حفظ کر سکتے ہیں،
لیکن اس قصیدے کو حفظ کر کے مبتدی کے لیے راہِ سلوک طے کرنا اور تفصیلات سے
گہری واقفیت کے بغیر صرف اُس پر ایک نظر ڈال کر پوری تعلیم و طریقۂ تعلیم سے واقف
ہونا ممکن نہیں۔ اس لیے کہ قصیدے کے اجمال (اگر اس کو اجمال کہا جا سکتا ہے) اور
اشاروں کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو تفصیل سے کماحقہٗ واقف ہے، اور یہ تفصیل معظم
کی کسی نظم میں نہیں ملتی۔ اس سے واقفیت کے لیے اُن کے دادا پیر حضرت امین کی
تصانیف کا مطالعہ ضروری ہے، جن میں اُنھوں نے اپنے نظامِ تصوف، اس کی ساری
تفصیلات اور تمام جزئیات کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے اور اُن کے سلسلے
کے دوسرے اربابِ رشد نے ان تعلیمات کو منتر کی طرح دہرایا ہے۔ معظم اور اِس
سلسلے کے دوسرے بزرگوں میں یہی فرق ہے کہ معظم تفصیل میں نہیں جاتے اور ان
بزرگوں کے ہاں صرف تفصیل ملتی ہے۔ اس لیے کہ معظم شاعر ہیں اور وہ اربابِ رشد
و ہدایت۔ بنا بریں خالدی صاحب کے اس ادعا سے بھی اتفاق نہیں کیا جا سکتا کہ

..... اس قصیدے کی حیثیت ایک ایسے متن کی ہے، جس کی تشریح
و تفسیر کے لیے اور کئی نظمیں لکھی گئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ معظم کے پورے

[1] ابو نصر خالدی، قصیدہ، قدیم اردو، جلد اول، صفحہ ۲۳۸



نظامِ فکر کو سمجھنے کے لیے یہ قصیدہ اجمالی تعارف کا کام دیتا ہے۔ اس
کو ان کے کلیات کا ایک ایسا منظوم مقدمہ تصور کیجیے، جس میں انھوں نے
مختصر طور پر وہ سب کچھ کہہ دیا ہے، جس کو انھوں نے دوسرے اصنافِ
سخن میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔“[1]

شاہ معظم نے زیرِ نظر قصیدے اور دوسرے کلام میں جس تصوف اور سلوک کو
پیش کیا ہے اور اُن کے بیان کے لیے جو اصطلاحیں استعمال کی ہیں، وہ جانم اور حضرت
امین کی دین ہیں۔ اُن کے تفصیلی مطالعے کے لیے راقم الحروف کی کتاب، سید شاہ
امین الدین علی اعلیٰ — حیات اور کارنامے، سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔ یہاں تفصیل
میں گئے بغیر صرف اُنھیں مسائل کی وضاحت کی جائے گی جو قصیدے میں آئے ہیں۔

قصیدے کا آغاز حسبِ ذیل اشعار سے ہوتا ہے:

مجھاں فرض ہے بوجھنا امر اللہ اکبر کا ؛ جو افلا تبصرو بولیا سو کیا ہے رمز دل بر کا
لوازم سب پو آیا ہے پچھانت چھانٹ کر چکنا ؛ جو یاں اندھا سو واں اندھا خبر ہے روزِ محشر کا

اللہ کا فرمان ہے: قُلِ الرُّوحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ، یعنی تو کہہ (اے محمدؐ) روح میرے
پروردگار کا حکم ہے، اور وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ، یعنی اور تمھارے نفسوں میں
ہے، کیا تم نہیں دیکھتے۔

روح امرِ رب ہے، یہی مظہرِ حق ہے اور سرِ ذات ہے۔

گر نبودے ذاتِ حق اندر وجود ؛ آب و گل را کے ملک کردے سجود

شیخ اکبر کہتے ہیں: ”جسم و صورتِ آدم حکمت ظہورِ احکام اسما و صفاتِ الٰہیہ ہے اور
روحِ آدم یعنی باطنی حالت حکمتِ ربوبیت و خلافت ہے۔ پس آدم ربوبیت و
اتصافِ صفاتِ الٰہیہ کے اعتبار سے عالم کے لیے حق ہے اور ربوبیت و عبودیت

[1] ابو نصر خالدی، قدیم اردو، جلد اول

کے اعتبار سے خلق ہے۔ یعنی بہ اعتبارِ روح حق ہے اور بہ اعتبار جسم و صورت خلق"۔

شاہ معظم نے قصیدے کے پہلے مصرعے میں تصوف کے اسی معرکہ آرا مسئلے کی طرف اشارہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ امرِ رب کی حقیقت اور اس کا عرفان سالک کے لیے ضروری ہے اور اسی سلسلے میں وفی انفسکم افلا تبصرون کی طرف رجوع کیا ہے یعنی جو کچھ سالک جاننا چاہتا ہے وہ کہیں اور نہیں خود اس کے اندر موجود ہے، اس کے نفس میں پوشیدہ ہے۔ ضرورت صرف اس کے کنہ تک پہنچنے کی ہے۔ اسی لیے رسول کریم نے فرمایا ہے: وَمَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ۔ یعنی جس نے اپنے نفس کو پہچانا، اس نے خدا کو پہچانا۔

تعینِ اعتباری اور غیریتِ مجازی کے طلسم کو توڑ کر عرفانِ نفس اور عرفانِ ذات بلکہ قربِ ذات حاصل کیا جا سکتا ہے، اور یہ سعی ہر ایک پر لازم ہے۔ اگر انسان عالمِ رنگ و بو کا اسیر اور غفلت کا شکار رہا اور اس نے عرفانِ نفس اور عرفانِ ذات میں سعی نہیں کی تو اس کی حالت اندھے کی سی ہے۔ ایسے اندھے کی جس کے بارے میں خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ومن کان فی ھٰذہٖ اعمٰی فھو فی الاخرۃ اعمٰی واضلّ سبیلاً، جو اس جہاں میں اندھا ہے وہ اُس جہاں میں اندھا، اور زیادہ دور جا پڑا راہ سے، یعنی جس کو یہاں دیدارِ ذات نصیب نہ ہو وہ ہمیشہ کے لیے دیدارِ الٰہی سے محروم رہے گا۔

اس کے بعد شاہ معظم کہتے ہیں کہ انسان دنیا میں بار بار نہیں آتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے جو ذمہ داریاں اس پر عاید کی ہیں اُن سے جلد از جلد عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اگر عشق کی دولت کو، جو امانتِ الٰہی ہے، ضائع کیا، خلافت کے منصب سے روگردانی کی، اسرار و رموز جو خود اس کے اندر پوشیدہ ہیں، کی بازیافت سے احتراز کیا تو اُس نے گویا دین اور دنیا دونوں کو برباد کیا۔ سالک کو چاہیے کہ ماسوا سے



رشتہ توڑ کر وصلِ الٰہی اور دیدارِ ذات کا آرزومند رہے، تلاوتِ وجود میں وقت گزارے، پیر کے آگے گردن جھکا دے اور اس کی رہنمائی میں سلوک کے منازل و مراحل طے کرے:

غرض ہے پھر کے آنائیں، اسی تے عرض کرتا ہوں
نبا ڈابیگ کر لیناعزیزاں پیش پستر کا
جو طالب، طلب دھرتا ہے، خدا سوں وصل ہونا کر
پٹی پڑہ من عرف کی ہو درس لے راہ، رہبر کا

اس کے بعد سلوکِ ابنیہ کے بعض لوازم و شرائط کی طرف اُچٹتے سے اشارے کیے ہیں، لیکن ان میں ربط و تسلسل نہیں ہے۔ پانچویں، ساتویں، چودھویں، پندرھویں، سولھویں اور اٹھارویں شعر میں یہ مضامین آئے ہیں۔

سالک کو چاہیے کہ پیرِ کامل کی رہنمائی میں مقام شیطانی سے نکلے اور مقامِ قرب کا سفر اختیار کرے۔ ان دو مقاموں کے درمیان چار راہیں اور چار منزلیں ہیں: اول راہِ شریعت و منزل ناسوت (مرتبہ واجب الوجود) دوم راہِ طریقت و منزل ملکوت، (مرتبہ ممکن الوجود) سوم راہِ حقیقت و منزلِ جبروت (مرتبہ ممتنع الوجود) چہارم راہِ معرفت و منزل لاہوت (مرتبہ عارف الوجود)۔ سالک ہر مرتبے کی راہ اور منزل سے گزرتا لوازم و شرائط کی تکمیل کرتا، شہادت اختیار کرتا، دوسرے مرتبے میں عروج کرتا ہے۔ پہلے مرتبے کی شہادت مبدا، دوسرے مرتبے کی شہادت وجدا، تیسرے مرتبے کی شہادت عہدا اور چوتھے مرتبے کی شہادت شہدا ہے، لیکن تعجب ہے کہ معظم نے پانچویں تن کی شہادت کو شہدا بتایا ہے۔ یہ یقیناً کتابت کی غلطی ہے۔ پانچواں مرتبہ یا پانچواں تن واحد الوجود ہے۔ اس مرتبے کو دوسرے بزرگ احدیت، مرتبہ لاالورا، ورا الوراء وغیرہ کہتے ہیں۔ معظم نے یہاں ورا الورا کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ یہ مرتبہ حق سبحانہٗ تعالیٰ کا

ہے جو واحد ہے۔ یہ وجود خود قائم ہے، قدیم القدیم ہے، ازل آزال ہے، لا جہت و لامکاں ہے، لا تعین و لا زماں ہے۔ اسی وجود سے عارف الوجود، ممتنع الوجود، ممکن الوجود اور واجب الوجود ظاہر ہوئے ہیں۔ اس لیے سالک کو مرتبۂ واجب الوجود سے ممکن الوجود میں، ممکن الوجود سے ممتنع الوجود میں، ممتنع الوجود سے عارف الوجود میں اور عارف الوجود سے واحد الوجود میں عروج کرنا چاہیے تاکہ مقامِ قرب نصیب ہو۔ جو صوفیہ اس مرتبے کو وراء الوراء کا نام دیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ جب سالک کی نظر زماں و مکاں ہر دو عالم سے مرتفع ہو جاتی ہے اور وہ ذاتِ حق کو لامکاں دیکھتا ہے تو مرتبہ وراء الوراء میں داخل ہوتا ہے۔

عارف الوجود (چوتھے تن) میں شہادت شہدا پر سلوک کے تمام مراحل مکمل ہو جاتے ہیں اور سالک کے لیے سعی و جہد کی کوئی گنجایش نہیں رہتی۔ وہ کامل تو ہو جاتا ہے لیکن محبوبیت و معشوقیت کا مرتبہ اس سے بالاتر ہے۔ اس کا حصول صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی پر منحصر ہے۔ یہ مقامِ معراج بہ طفیل آں حضرت میسر آتا ہے۔

واحد الوجود میں سالک پر دو تجلیوں کا ظہور ہوتا ہے۔ ایک تجلی جلالی اور دوسرے جمالی۔ تجلی جلالی مرتبۂ عاشقیت ہے اور تجلی جمالی درجہ معشوقیت و محبوبیت۔ دوسری تجلی، پہلی تجلی سے افضل ہے۔ اس سے آگے کوئی مرتبہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے مرتبۂ عاشقیت پر فائز کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے مرتبۂ معشوقیت پر۔ معظم نے صرف مرتبۂ عاشقیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اس کے بعد پانچ موذیوں، چھ غفلتوں اور سات مستیوں کا ذکر ہے۔ حالاں کہ ان کا ذکر ابتدا میں ہونا چاہیے تھا۔ اس لیے کہ حضرت امین پانچ عناصر، پچیس گن، ان کے لوازمات وغیرہ کی تفصیل اور موذیوں، غفلتوں، مستیوں وغیرہ کا بیان واجب الوجود کے تحت کرتے ہیں۔

پانچ موذیوں سے مراد حواسِ خمسۂ ظاہری، چھ غفلتوں سے مراد طمع[1]، تکبر، غصہ[2]



دہشت، بیماری اور پیری اور سات مستیوں سے مراد ذات، نسب و نسل، وسیلے، حسن، ہنرمندی، علمِ ظاہر، مال و دولت، حکومت و اقتدار کا غرور ہیں۔ یہ فانی ہیں لیکن ایک مستی کو بقا ہے اور وہ حبِ ذاتِ الٰہی ہے۔

معظم کہتے ہیں کہ سالک کو چاہیے کہ وہ حواسِ خمسۂ ظاہری پر قابو پائے، حواسِ خمسۂ باطنی کو کام میں لائے، مکاں کے قیود سے آزاد ہو کر لامکاں کی راہ اختیار کرے۔ جو چیز جس میں قرار پاتی ہے وہ اس کا مکان ہے۔ مثلاً: صفا مکانِ باد اور باد مکانِ آتش اور آتش مکانِ خاک اور خاک مکانِ آب ہے۔ سالک کو چاہیے کہ صفا کو ہوا میں، ہوا کو صفا میں، مکاں کو لامکاں میں لامکاں کو مکاں میں دیکھے، اس لیے کہ جمیع مراتب ایک دوسرے کا مظہر و مسکن ہیں۔

طمع، تکبر، غصہ، دہشت، بیماری اور پیری غفلتیں ہیں اور غفلتوں کا سرچشمہ بھی۔ سالک کو چاہیے کہ ان غفلتوں کو اپنے پر طاری ہونے اور غلبہ پانے کا موقع نہ دے، بلکہ ہمیشہ اُن سے چوکس رہے۔ تبھی وہ پنج گنج یعنی پانچوں وجودوں یا پانچویں وجود کی دولت سے بہرہ ور ہو سکتا ہے۔

نسب و نسل، وسیلے، حُسن، ہنرمندی، علمِ ظاہر، مال و دولت اور حکومت و اقتدار کے غرور کو کچلے اور ان کی نفی کرے اور حبِ ذاتِ الٰہی کے نشہ میں سرشار رہے، اسی صورت میں اس کو مقامِ قرب حاصل ہو سکتا ہے۔

یہاں اس بات کی صراحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ سلوکِ امینیہ میں موذیوں، غفلتوں اور مستیوں کا تعلق پہلے تن یعنی واجب الوجود سے ہے۔ ان پر قابو پانے اور دوسرے شرائط و لوازم کی تکمیل کے بعد سالک اوپر کے مرتبے میں داخل ہوتا ہے۔ "پنج گنج"، "لامکاں کا گھر" اور "قرب کا محل" تو آخری یعنی پانچویں مرتبے میں حاصل ہوتا ہے۔ شاہ معظم نے ایک ہی جست میں درمیانی مراتب طے کرا دیے ہیں:

مقاماں ہور منزل کو جو لیاوے چار، رہبر سوں
رفیق ایسا اچھے رہ بر جو واقف خیر ہور شر کا

اول زاہد سوں عارف ہو سو بعد از عاشق ہو واصل
دراول درا ہے درجہ (جو) چل کر باٹ سرور کا

شہادت پانچ تن سوں ہو جو پانچے تو کتے شہدا
لقب عشاق اُس کا ہے وہ محرم رازِ دل بر کا

قتل کر پانچ موذیاں کوں ایذا تج نیں دیوے تب لگ
نکل شش جہت سوں باہر ملے مارگ لامکاں گھر کا

نہ پڑ شش غفلتاں میں توں اگر ہے عاشقِ صادق
کہیں تج گنج پاوے توں تو مالک ہفت کشور کا

نفی کر سات مستیاں کوں جو ہووے اثباتِ حب مولا
قرب کا محل پاوے تو وہ صاحب تخت افسر کا

شاہ معظم نے چھٹے شعر میں جس سلوک کی طرف اشارہ کیا ہے، اس کا تعلق وجوداتِ خمسہ سے نہیں ہے:

نفس، دل، روح سوں تجھ کوں کرے سر، نور سوں آشنا
سو بعد از نور میں دیکھے تو دستا ذات انور کا

اس سلوک کا سرچشمہ فیضان حدیث قدسی: اِنَّ فِی جَسَدِ آدَمَ لَمُضْغَةً وَفِی الْمُضْغَةِ قَلْبٌ وَفِی الْقَلْبِ فُؤَادٌ وَفِی الْفُؤَادِ رُوْحٌ وَفِی الرُّوحِ سِرٌّ وَفِی السِّرِّ نُورٌ وَفِی النُّورِ اَنَا ہے، اور سالک کو معرفتِ من عرف کے لیے مراتب نفس، دل، روح، سر اور نور سے گزرنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کے بعد ذات کا مرتبہ ہے۔

قصیدے کے دوسرے اشعار میں شاہ معظم کہتے ہیں کہ ایسے علم سے کیا حاصل



جس سے عرفانِ ذات اور وصالِ حق نصیب نہ ہو۔ دفتر کے دفتر کھنگال ڈالیے، کچھ حاصل نہ ہوگا۔ ایک نقطے کا عرفان کافی ہے۔ یہ نقطہ کیا ہے! ذات بحت، جس میں کل کائنات مخفی ہے جانم کہتے ہیں "العلم نقطہ۔ آں کدام است! ذات باری تعالیٰ کہ عالم الغیب و الشہادت، آں نکتہ قدیم است کہ از نکتہ او ہمہ نکات باز آمدند۔"[1]

معظم دراصل یہ کہہ رہے ہیں کہ علم ظاہر یعنی کتابی علم حقیقی علم نہیں ہے بلکہ علمِ باطن اور علم لدنی ہی حقیقی علم ہے۔ یہ حاصل ہو جائے تو انسان پر سب کچھ منکشف ہو جاتا ہے اور یہ حاصل نہ ہوا تو علم ظاہر میں کمال کے باوجود انسان اصلِ حقیقت اور سرِ علم سے بے بہرہ رہتا ہے۔

ہوا ہیں حق سے واصل علم تحصیل کیا تو کیا
پچھانت ایک نکتہ ہے رعبث کیا کام دفتر کا

زاہد ساری عمر عبادت و ریاضت میں گزار دیتا ہے لیکن اس کو کچھ حاصل نہیں ہوتا اور اگر ہوتا بھی ہے تو عارف کی یافت کے مقابلے میں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس لیے کہ ایک گھڑی کا تفکر ستر برس کی عبادت سے افضل ہے۔ قرآن میں آیا ہے۔ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ (نماز بے حیائی و بدکرداری کو روکتی ہے اور البتہ ذکر الٰہی سب سے افضل ہے)

زہد کر زاہداں مرتے عجب ہے مشرب رنداں
تفکر ساعت کا کرتے عبادت برس ستر کا

سالک تمام مراحل و منازل طے کرنے کے بعد واحد الوجود میں آتا ہے، تو ذاتِ حق میں فنائے اتم حاصل کر کے باقی بہ بقائے ذاتِ حق ہو جاتا ہے۔ مرتبہ محبوبیت بہ طفیل آں حضرت حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے کہ عارف کی انتہائی حد سید اللہ فی الوصول لرسول

---

[1] جانم کلمۃ الحقایق (مرتبہ اکبر الدین صدیقی) صفحہ ۱۰۸

مع الرسول ہے۔ سیر اللہ فی اللہ مع اللہ رسول اکرم کے ساتھ خاص ہے۔ عرفا جس قدر تجلیات الٰہی کا مشاہدہ کرتے ہیں وہ رسول اکرم کے اندر ہی کرتے ہیں۔ اگر یہ واسطہ درمیان سے ہٹ جائے تو سرے سے کائنات ہی ختم ہو جائے۔ سوائے رسول اکرم کے کسی میں راست معرفتِ الٰہی حاصل کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔

فنا فی اللہ ہو اول توں وشاہد ہو رھتا باقی

نقابِ کبریا میانے وصل ماہِ منور کا

سالک کی منزل حور و قصور نہیں دیدارِ ذات ہے۔ سالک اور زاہد میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ایک دیدار کا آرزومند ہے اور دوسرا جنت کا طالب، ایک کے حوصلے کی کوئی حد و انتہا نہیں اور دوسرا پست ہمت۔ ایک اپنے عزائم کی وجہ سے مردوں کا مرد ہے اور دوسرا اپنے مقصد کی بے مائیگی کے اعتبار سے عورتوں سے بھی گیا گزرا۔ کسی بزرگ کا قول ہے: طَالِبُ الدُّنْیَا مُخَنَّثٌ وَطَالِبُ العقبیٰ مُؤَنَّثٌ وَطَالِبُ الْمَوْلیٰ مُذَکَّرٌ، یعنی دنیا کا طالب مخنث، عقبیٰ کا طالب مونث، مرد وہی ہے جو دنیا اور عقبیٰ دونوں سے بے نیاز ہے اور اس کی نظر اپنے مولا پر لگی ہوئی ہے۔ معظم نے طالبِ دنیا کو در خورد اعتنا نہیں سمجھا، اس لیے اس کو نظر انداز کر دیا ہے

بجز دیدار اے سالک نہ منگ فردوس ہرگز توں

بہت سب میں تفاوت ہے مونث ہور مذکر کا

اللہ تعالیٰ دو عالم کا مالک ہے اور بحر و بر میں جتنی مخلوق ہے اُس کا پرورش کرنے والا ہے۔ اُس کی رحمتوں کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ اس لیے سالک کو کسی منزل اور کسی مرحلے پر مایوسی کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ خود اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "کہ دو کہ اے میرے بندو، جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، خدا کی رحمت سے نا امید نہ ہونا۔"



امید لاتقنطو کی رکھ نہ کر کچھ فکر ہرگز توں

وہ مالک ہے دو عالم کا وہ رازق بحر ہور بر کا

کسی بزرگ کا قول ہے: علم کی انتہا یہ ہے کہ انسان اللہ کو پالے۔ یہ علم کیا ہے؟ تلاوتِ وجود، عرفانِ نفس و عرفانِ بطون، یعنی انسان خود اپنی ذات میں فکر کرے۔ اس لیے کہ وجودِ انسانی مظہرِ ذات و صفات ہے۔ خانوادۂ امینیہ کی تعلیم ہے کہ سالک کو چاہیے کہ وہ اپنے وجود میں پانچوں وجودوں کی یافت کرے۔ عرفان ذات اسی طرح ممکن ہے۔[1]

حدود العلم حتیٰ یعرف اللہ کر خبر دیتا

نگہ کر تو بطوں میں توجہ ہوے تج کشف برتر کا

اس قصیدے کا ایک شعر بہت عجیب ہے:

کتک عوام کہتے ہیں جو ظاہر دیکھنا حق کوں

جو کچھ دستا سو فانی ہے کنا کیوں روپ یاور کا

معظم کہتے ہیں کہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ خدا کو ظاہر و آشکار دیکھنا چاہیے، لیکن جو کچھ دکھائی دیتا ہے، فانی ہے۔ فانی کو خدا کا مظہر کس طرح سمجھا جا سکتا ہے؟

پتا نہیں کہ اس بات میں معظم کا محض شاعرانہ تیکھا پن ہے یا اُنھوں نے جو کچھ کہا ہے ایک مسئلے کے طور پر کہا ہے۔ اس لیے کہ ساری کائنات اللہ تعالیٰ کی جہت تشبیہہ ہے شیخ کہتے ہیں کہ خدا مقید میں مقید ہے اور مطلق میں مطلق۔ تقید اور تعین جو وجود کو عارض ہوتا ہے، فانی ہے، وجود فانی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ھو الباطن ہی نہیں ھو الظاہر بھی ہے۔

---

[1] محمود خوش دہاں کہتے ہیں کہ سالک اپنے وجود میں چار وجودوں کی یافت کرے"۔ سالک را باید کہ ایں چہار مراتب وجود (واجب الوجود، ممکن الوجود، ممتنع الوجود و عارف الوجود) در وجودِ خود بشناسد و برسد و بگذرد تا بمعرفت ذاتِ سبحانہٗ و تعالیٰ برسد"، معرفت السلوک۔

ما بہ الموجودیت سے وجود منتزع ہوتا ہے اور وجود کل یوم ھو فی الشان ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کے سوا جہاں ہر شئے فانی ہے وہیں ہر شئے مجلائے الٰہی بھی ہے۔

بہرحال اپنے سلسلے کی تعلیمات کے بعض پہلوؤں کو اس مختصر قصیدے میں شاہ معظم نے اس قدر گتھا کر بیان کیا ہے کہ وہ ان کے سلسلہ تعلیمات کا ایک ناتمام اشاریہ (بقول خالدی صاحب مقدمہ نہیں) بن کر رہ گیا ہے۔ وہ حسب عادت اس قصیدے کو بھی اپنے پیر قادر لنگا کے ذکر پر ختم کرتے ہیں، جس کے ساتھ پیر کے پیر حضرت امین کا نام بھی آگیا ہے۔

ہوا تر لوک پر غوغا کہ ثانی آیا یوسف

نویلا لال قادر شاہ صورت لے سب پیمبر کا

وہی ہر راہ دکھلانے امین الدین ہو آیا

وہ شافع روزِ محشر ہے وہ ساقی حوضِ کوثر کا

معظم تو بندہ ہو رہ، خدا ہونا تو مشکل ہے

سمجھ محیط مطلق کوں حد لے داد داور کا





# گفتار عقل و عشق

اس مختصر مثنوی کا ایک ناقص نسخہ کتب خانۂ ادارۂ ادبیات اُردو کی اُس قدیم بیاض (مخطوطہ نمبر ۳۷۰) میں ہے، جس میں مرزا، شاہی، خوشنود، صادق، مشرف، شاہ راجو اور جانم[1] جیسے معروف اور مراد، فصیح الدین، محبت اور قربان علی جیسے غیر معروف شعرا کے مراثی کے علاوہ سراج کے چند شعر اور گوہری کی ایک رباعی شامل ہے یہ بیاض ۱۱۱۶ھ ہجری سے قبل لکھی گئی ہے۔ چناں چہ ورق (۱۴) کی پیشانی پر ایک بیضوی مہر ثبت ہے، جس میں "اللہ محمد علی ۱۱۱۶ھ ہجری" درج ہے۔

اس نسخے میں کل آٹھ شعر ہیں۔ مثنوی کا نام کہیں درج نہیں ہے۔ ڈاکٹر زور نے غالباً موضوع اور مضامین کے اعتبار سے اس کا عنوان "مثنوی مناظرہ عقل و عشق" تجویز کیا ہے۔

ابو نصر خالدی صاحب کو اس مثنوی کا ایک اور نسخہ ان کے "ایک دیرینہ کرم فرما"

---

[1] ڈاکٹر زور نے شاعر کا نام روحی بتایا ہے، لیکن یہ درست نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو۔ تذکرۂ مخطوطات ادارۂ ادبیات اردو، جلد اول، صفحہ ۲۶۴، ڈاکٹر زور نے نمونے کا جو آخری شعر نقل کیا ہے اس میں جانم کا تخلص موجود ہے۔ آخری شعر کے پہلے مصرعے میں روحی کے لفظ سے انھیں تسامح ہوا ہے۔ یہ تخلص نہیں ایک اصطلاح ہے۔

کی مملوکہ بیاض سے دست یاب ہوا ہے، جس میں دس شعر ہیں

ادارے کے نسخے کا ہر پہلا مصرع "عقل" سے اور دوسرا مصرع "عشق" سے شروع ہوتا ہے۔ مثلاً اس نسخے کا پہلا شعر ہے:

عقل کہتی علم پڑنا لکھنا سیکھ ؎ عشق کہتا درس کا تو مانگ بھیک

لیکن خالدی صاحب کے نسخے کے ہر پہلے مصرعے میں "عقل" سے پہلے "مجھ" اور ثانی مصرعے میں "عشق" سے پہلے "اور" کا اضافہ ہے:

مجھ عقل کہتی علم پڑھ لکھنے کو سیکھ ؎ اور عشق کہتا درس کا جا مانگ بھیک

خالدی صاحب نے اپنے "دیرینہ کرم فرما" کے نسخے کا ادارے کے نسخے سے مقابلہ کر کے اس مثنوی کو "گفتار عشق و عقل" کے نام سے رسالۂ قدیم اردو، جلد اول، سنہ ۱۹۶۵ء میں شائع کیا تھا۔ انھوں نے اپنے "دیرینہ کرم فرما" کے نسخے کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے۔ اس لیے معلوم نہ ہو سکا کہ اس نسخے پر مثنوی کا نام گفتارِ عشق و عقل لکھا ہے یا اُنھوں نے ڈاکٹر زور کے دیے ہوئے نام میں تصرف کر کے مناظرہ عقل و عشق کو گفتارِ عشق و عقل بنا دیا ہے۔

مناظرۂ عقل و عشق کے مقابلے میں گفتارِ عشق و عقل زیادہ بہتر عنوان ہے۔ اس لیے کہ مثنوی کے مضامین کی نوعیت مناظرے کی نہیں گفتار کی ہے۔ شاہ معظم نے سوائے پہلے شعر کے مثنوی کے ہر شعر کے پہلے مصرعے میں عقل کی اور دوسرے مصرعے میں عشق کی گفتار کو نظم کیا ہے۔ اس لیے عنوان بھی اسی ترتیب کا متقاضی ہے۔ بنا بر ایں اس مثنوی کا عنوان گفتارِ عقل و عشق تجویز کیا جاتا ہے۔

ہمارے حکما اور صوفیہ، قدیم سے حصولِ علم کے دو ذرائع عقل و عشق کو دو متضاد قوتوں کی حیثیت سے تسلیم کرتے آئے ہیں، اور عقل پر عشق کو ترجیح دیتے رہے ہیں۔ تمام صوفیہ نے عموماً اور صوفی شعرا نے خصوصاً عقل کے مقابلے میں عشق کو اتنی اہمیت



دی ہے کہ عقل کی طاقت ہیچ اور ناکارہ معلوم ہونے لگتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ عقل کو اتنا گرایا کہ نفس کے تمام مذموم داعیات کا وہ سرچشمہ اور آلۂ کار سمجھی جانے لگی۔ اسی طرح معرکۂ خیر و شر میں عشق کو خیر کا اور عقل کو شر کا علم بردار بنا کر دونوں کو ایک دوسرے کا حریف اور مقابل بنا دیا گیا۔ اگر ہم برگساں کی طرح وجدان کو عقل کی اعلیٰ کارفرمائی سے تعبیر نہ بھی کریں تب بھی یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ عقل و شعور کی توانائی ہی پر ہماری مادی زندگی کا دار و مدار ہے۔ عقل کی قوت اسباب و علل کے سہارے علم حاصل کرتی ہے اس لیے اس کی کارفرمائی زندگی کے مادی مظاہر تک محدود ہے۔ وہ حقیقت کا ادراک تو نہیں کر سکتی لیکن انفس و آفاق پر غور کر کے حقیقت کے قریب تک پہنچ جاتی ہے۔ اس کے برخلاف عشق یا وجدان وہ توانائی ہے جو حقیقت کا راست ادراک کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اُس کو اسباب و علل کے سہاروں کی ضرورت نہیں ہوتی۔

ادراکِ حقیقت کے تعلق سے عقل و عشق کی توانائیوں کے اس فرق کی بنا پر یہ نتیجہ اخذ کرنا بداہت اور معقولیت کے خلاف ہے کہ عقل کی قوت ہیچ اور ناکارہ ہے یا یہ کہ عقل داعیِ شر ہے۔ عقل اور عشق کی توانائیوں اور ان کی کارفرمائیوں کے حدود کے بارے میں پہلی مرتبہ اقبال نے معقول اور متوازن نقطۂ نظر پیش کرتے ہوئے ہمارے صوفیہ اور شعرا کی غیر معتدل رائے کی اصلاح کی ہے

دکھنی شاعری میں عقل اور عشق کی کرشمہ سازیوں کا ذکر تو ملتا ہے لیکن نصرتی[1] اور علی عادل شاہ ثانی شاہی[2] نے ان موضوعات پر جو زورِ بیان صرف کیا ہے، ان کی مثال نہیں ملتی۔

---

[1] ملاحظہ ہو، گلشن عشق مرتبہ سید محمد، صفحہ ۴۲ تا ۵۱

[2] ملاحظہ ہو، قصیدہ در حمد اور قصیدہ در منقبت دوازدہ امام علیہ السلام کلیاتِ شاہی، صفحہ ۱۰۲،۱، مرتبہ ڈاکٹر زینت ساجدہ۔

نصرتی عقل کو نصف الکرامت بلکہ فوق الکرامت تسلیم کرتا ہے اور اس کو دین و دنیا کی کامیابی کی کلید ٹھہراتا ہے۔

بزرگاں کا یو نقل حجت اہے ٭ کہ العقل نصف الکرامت اہے
کتا بلکہ فوق الکرامت سدا ٭ کہ اس عقل سوں ہم پچھانے خدا
اچھے عقل یک دولتِ ناپدید ٭ اچھے عقل مشکل کی حل کی کلید
اچھے عقل پیرایۂ بندگی! ٭ اچھے عقل سرمایۂ زندگی
دیوے عقل نت ملک شہ کوں نوا ٭ ولی کی ولایت کوں ہے پیشوا
چلے عقل تے دین و دنیا کے کام ٭ دونوں جگ میں عاقل وسے نیک نام

لیکن اس کے باوجود وہ عشق کو عقل پر فضیلت بخشتا ہے:

کتا عقل کوں میں تو شاہِ زماں ٭ نہ ہوتا اگر عشق صاحب قرآں
کہ جس ٹھار پر ہوے شرزے کی چال ٭ تو اس ٹھار گج کا چلے کیا مجال
اٹل عقل کا گرچہ گج مست ہے ٭ ولے عشق شرزہ زبردست ہے

اور کہتا ہے:

بقا کی جسے جگ میں شاہی اچھے ٭ اجل جس کے گھر کا سپاہی اچھے
دیوا راہ کا تجھ سو کالا دسے ٭ اندھارا چ تیرا اوجالا دسے
ترا خار بہتر ہے گلزار تے ٭ ترا اور ہے دیوانہ ہشیار تے
چڑاوے ستی کوں ترالے مدن ٭ دکھاوے تسے آگ کر پھولبن
نصیحت کو تجھ شہر میں غدر ہے ٭ ترے ملک میں صبر بے قدر ہے

شاہی نے عقل اور عشق کا موازنہ نہیں کیا ہے بلکہ دو علاحدہ قصیدوں میں ان کی الگ الگ بڑائی کی ہے۔ چناں چہ عقل کی تعریف میں کہتا ہے:

عقل کا مکتب ہوا فہم کے پڑھنے بدل ٭ عقل معلم اہیں قصہ سکھایا کہن



عقل خبردار ہے عقل ہمہ کار ہے ٭ عقل کا جاسوس ہو مک پے اچھے یو کرن
بال تسے باریک تر راہ اچھے جو کو مل ٭ باؤ کے دھجتے ہیں پگ عقل کیا واں گون
عقل کا جس گھٹ منے پور اچھے گا گھٹا ٭ حق کوں وہی پا اول راہ لگاوے لگن

اور عشق کی مدح کرتے ہوئے ایک شعر میں عقل اور عشق کا مقابلہ اس طرح کیا ہے:

نادر ہوا سلطان یو اب بُد کیا حیران ہو
جب عشق کے پردھان مل بُدسات صف در صف لڑے

ان اشعار میں بھی ندرتِ فکر اور ندرتِ بیان کے باوجود عقل و عشق کے وہی پرانے تصورات کی کارفرمائی نظر آتی ہے، جن کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے، لیکن تعجب ہے کہ معظم نے زیرِ نظر مثنوی میں اپنے عہد کے مروجہ تصورات کے برخلاف نہایت متوازن اور معقول نقطۂ نظر اختیار کیا ہے۔ وہ نہ تو عقل کو ناکارہ قرار دیتے ہیں اور نہ شر کارہ، بلکہ اس قوت کو اُس کے مادی مزاج کے پیشِ نظر پابندیِ اعمالِ شریعت کا داعی قرار دیتے ہیں۔ وہ عقل کی اس تحریک و ترغیب کا بھی ذکر کرتے ہیں جو مادی زندگی کو سنوارنے کا باعث ہوتی ہے تو اس کو شر پسند، حیلہ جو اور معصیت کار نہیں بتاتے بلکہ اس کی عظمت اور رفعت ہی کو اجاگر کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں کہیں کہیں تو فکر یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ اِس مقام پر عقل کی رہبری درست ہے یا عشق کی۔

اردو شاعری میں عقل و عشق کے مباحثوں، مناظروں اور مقابلوں کی کمی نہیں، لیکن اس پورے سرمایے میں اقبال سے پہلے شاید معظم کے علاوہ کسی اور شاعر نے ایسا سلجھا ہوا نقطۂ نظر اختیار نہیں کیا ہے۔ نثر میں، البتہ وجہی نے عقل کی تعریف میں بڑا زورِ قلم دکھایا ہے۔

معظم عقل اور عشق کی متضاد تحریکات و ترغیبات کا جائزہ لینے سے پہلے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے دو یار دیے ہیں، ایک عقل اور دوسرا عشق:

مجھ حق دیا ہے پیار کر دیکھ یار دو ٭ اک عشق دوسرا عقل ہے دل دار یو

پہلے شعر ہی سے معظم کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ وہ عام شعرا کی طرح عقل کو ناقص، فتنہ کار اور راہ زن نہیں سمجھتے بلکہ عشق کی طرح عقل کو بھی زندگی کے لیے ایک ممد ومعاون توانائی قرار دیتے ہیں، اور ان دونوں طاقتوں کو اپنا رفیق اور یاور سمجھتے ہیں۔ یہی اُن کے نقطۂ نظر کی صحت مندی کی دلیل ہے۔

نظم کا اسلوب یہ ہے کہ عقل ایک مشورہ دیتی ہے اور عشق دوسرا مشورہ دیتا ہے۔ اِن دونوں کے مشوروں میں تضاد ہے۔ اس کے باوجود سوائے ایک آدھ شعر کے ہر جگہ یہی محسوس ہوتا ہے کہ عقل کا مشورہ زندگی کے مادی مقتضیات کے مطابق ہے۔ اس لیے اپنے اندر وزن اور وقار رکھتا ہے۔ عشق کا مشورہ عقل کے مشورے سے مختلف بلکہ متضاد ہے۔ اس لیے کہ وہ اسباب وعلل کی منزلوں کو درجہ بہ درجہ طے کرنے کا قائل نہیں، بلکہ ایک جست میں حقیقت تک پہنچ جانا چاہتا ہے۔

عقل معظم کو مشورہ دیتی ہے کہ اے معظم علم حاصل کر اور لکھنا پڑھنا سیکھ، لیکن عشق کہتا ہے، یہ سب فضول ہے۔ ان سب کو چھوڑ کر دیدارِ یار کی بھیک مانگ:

مجھ عقل کہتی علم پڑھ لکھنے کو سیکھ ؁ اور عشق کہتا درس کا جا مانگ بھیک

اس شعر کو پڑھ کر قیاس ہوتا ہے کہ معظم نے جب یہ شعر کہا تھا تو ان کے ذہن میں خسرو کا حسب ذیل شعر ضرور ہوگا:

خسرو غزل وکتاب تا چند ؁ در مصحف روے او نظر کن

عقل کہتی ہے: اے معظم علما کی صحبت اختیار کر اور عشق کہتا ہے کہ علم سے بے زار ہو جا:

مجھ عقل کہتی عالماں سے یار ہو ؁ اور عشق کہتا علم سے بے زار ہو

عقل کہتی ہے: اے معظم صوم وصلوات اختیار کر اور عشق کہتا ہے کہ معرفتِ الٰہی حاصل کر اور تکلیف شرعی سے نجات پا لے:



مجھ عقل کہتی صوم اور کرنا صلات ؁ اور عشق کہتا حق سے مل پانا نجات

اس طرح ہر شعر میں ان دونوں طاقتوں کا ذکر کرتے چلے گئے ہیں:

مجھ عقل کہتی کام کرنا ہے ثواب ؁ اور عشق کہتا رات دن پینا شراب
مجھ عقل کہتی شہ سے مل انعام لے ؁ اور عشق کہتا ہے سو دولت چھوڑ دے
مجھ عقل کہتی سیکھ کچھ کیمیا گری ؁ اور عشق کہتا چھوڑ کر بازی گری
مجھ عقل کہتی زر خرچ کر لے قضا ؁ اور عشق کہتا چڑکے تازی کر غزا

اور آخری شعر میں عقل کا مشورہ ہے: اے معظم، اٹھ اور کچھ کام کر۔ ظاہر ہے کہ یہ مادی زندگی عمل اور تدبیر کی زندگی ہے۔ اس کے برخلاف عشق کا مشورہ ہے کہ اے معظم دنیا کی کشاکش سے یک لخت بے تعلق ہو جا اور قادر کی ذات میں فنا ہو کر قلب مطمئنہ اور نشاط تام حاصل کر:

مجھ عقل کہتی اٹھ معظم کام کر ؁ اور عشق کہتا قادر سے مل آرام کر

جیسا کہ تمہید میں اشارہ کیا جا چکا ہے، معظم نے اس مثنوی میں عقل کی کارفرمائی، اس کے حدود، مقتضیات اور مزاج کی پوری رعایت ملحوظ رکھی ہے اور زندگی میں شعور کی اہمیت اور افادیت کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ اگرچہ پوری نظم میں کہیں بھی شاہ معظم نے عقل اور عشق میں سے کسی کی تائید نہیں کی ہے، لیکن مجموعی آہنگ سے صاف ظاہر ہے کہ عشق کا مشورہ شاعر کی افتادِ طبع کے عین مطابق ہے۔ اس کے باوجود اس نے معقولیت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور عقل کی اہمیت افادیت اور عظمت کو پوری طرح تسلیم کیا ہے۔ البتہ صرف ایک شعر میں عقل کی حیلہ گری کی طرف اشارہ ملتا ہے:

مجھ عقل کہتی زر خرچ کر لے قضا ؁ اور عشق کہتا چڑکے تازی کر غزا

لیکن اس شعر سے بھی عقل کی توہین اور تحقیر مقصود نہیں بلکہ دراصل وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ وہ توانائی جو مادی زندگی کو سنوارنا اور نکھارنا چاہتی ہے وہ بے مقصد کی تکمیل کے لیے

مصلحت، اندیشی اور کام جوئی پر بھی اتر آتی ہے۔ یہ بھی درحقیقت قوتِ عقل کے مزاج کا ایک تقاضا ہے۔

یہ مختصر مثنوی سلاستِ زبان، زورِ بیان اور روانی کی وجہ سے اہمیت رکھتی ہے۔





# سوالِ صادق و جوابِ معظم

شاہ معظم کی ایک غزل اُن کے دیوان کے علاوہ بیاضوں میں بھی دست یاب ہوتی ہے، جس سے اُس کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ غزل انھوں نے شاہ صادق اورنگ آبادی کے جواب میں لکھی تھی۔ شاہ صادق اپنے عہد کے مشہور صوفی اور صاحبِ ذوق شاعر تھے۔ شاہ کمال شاہ فی الحال اور بعض دوسرے صوفی شعرا نے اُن کا ذکر کیا ہے اور تصوف کے مسائل بیان کرتے ہوے ان کے شعر نقل کیے ہیں، مثلاً شاہ کمال نے اپنی کتاب کمالاتِ کمالیہ میں یہ دل چسپ شعر نقل کیا ہے:

کیا نفع لوہو سے جو ترے لکھے انا الحق
چوری کا گڑ چھپا کر مکہ موند چپ نگل جا

وجدی اور شاہ صادق کے درمیان گہرے مراسم تھے۔ چناں چہ وجدی نے مخزنِ عشق انھیں کی ایما پر لکھی تھی۔[1]

شاہ صادق صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ سخاوت مرزا کا بیان ہے کہ اُن کے دو دیوان مولوی عمر یافعی صاحب کے کتب خانے میں موجود تھے اور غالباً کتب خانہ انجمن ترقی اردو میں بھی ایک تھا۔[2] شاہ صادق کی ایک غزل جس کی حیثیت

---

[1] [2] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، سخاوت مرزا صاحب کا مضمون "اردو کی ایک قدیم بیاض" رسالہ اردو، بابت اپریل ۱۹۵۴ عیسوی، صفحہ ۳۲

سوال بند کی سی ہے، بہت مشہور ہوئی۔ سخاوت مرزا کا بیان ہے کہ شاہ کمال اور شاہ فی الحال وغیرہ نے اس کی تضمین کی تھی[1] لیکن سوال نامے کی تضمین کچھ سمجھ میں نہیں آتی، ممکن ہے کہ ان حضرات نے شاہ صادق کے سوالات کے جوابات نظم کیے ہوں اور ہر سوال کے ساتھ اس کے جواب کا شعر جوڑ دیا ہو، جس کو مرزا صاحب نے تضمین سمجھ لیا۔ چناں چہ شاہ معظم کے جواب کو بھی وہ تضمین ہی سمجھتے ہیں۔ صادق کی غزل کا مطلع یہ ہے:

سائل ہوں میں عزیزاں اِس کا جواب بولو
مَن عَرف ہور فقد کے کیتے ہیں باب بولو

یہ گیارہ شعر کی غزل ہے، جس کے ہر شعر میں ایک سوال اُٹھایا گیا ہے[2]۔ شاہ معظم نے بھی اس غزل کا جواب لکھا ہے اور ہر سوال کا انتہائی مختصر اور جامع جواب دیا ہے۔ سخاوت مرزا لکھتے ہیں:

"شاہ معظم خلیفہ قادر سنگھ[3] کوتال خلیفہ امین الدین اعلیٰ بیجاپوری نے تو شاہ صادق" کی اس غزل پر تضمین کی ہے اور چونتیس بیت لکھے۔"[4]

سخاوت مرزا صاحب نے اس غزل کے لیے مجموعۂ تحفۂ انوار، کتب خانۂ آصفیہ، کا حوالہ دیا ہے۔ یہ حوالہ انھوں نے حسبِ عادت ادھورا دیا ہے، جس کی وجہ سے مجموعۂ تحفۂ انوار تک رسائی نہ ہو سکی، البتہ راقم الحروف کو مواد کی چھان بین کے دوران اس غزل کے چار نسخے دست یاب ہوئے ہیں، جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، سخاوت مرزا صاحب کا مضمون "اردو کی ایک قدیم بیاض" رسالہ اردو، بابت اپریل سنہ ۱۹۵۴ء، صفحہ ۳۲، [2] سخاوت مرزا نے صرف صادق کی غزل نقل کی ہے۔
[3] قادر سنگھ نہیں، قادر لنگا ہے۔
[4] رسالہ اردو۔ بابت اپریل سنہ ۱۹۵۴ عیسوی، صفحہ ۳۲



۱۔ کتب خانۂ آصفیہ، حیدر آباد

مخطوطہ نمبر (۲۷۵۹) جدید، تعداد صفحات (۲)، تعداد اشعار (۱۱)
اس نسخے میں شاہ صادق کی غزل پہلے لکھی ہے اور لوح پر "سوال غزل دکھنی" درج ہے۔ شاہ صادق کی غزل کے خاتمے پر "در جواب آں نویسد" کی سرخی کے تحت معظم کی غزل نقل کی ہے۔ شاہ صادق کی غزل بارہ اشعار پر اور شاہ معظم کی غزل گیارہ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس نسخے میں شاہ صادق کی غزل میں جو شعر زاید ہے وہ حسب ذیل ہے:

قادر ہوا ہے شہرت لے کر اٹھا ہے یوں کر
کوئی حل کرو مسائل اس کا جواب بولو

خاتمے پر "تمت تمام شد سوال وجواب وجودیہ" لکھا ہے۔
یہ نسخہ کرم خوردہ ہے اور بہت غلط لکھا گیا ہے۔

۲۔ کتب خانۂ راقم الحروف

تعداد صفحات (۲) تعداد اشعار (۱۱)،
اس نسخے میں بھی سوال وجواب دونوں شامل ہیں۔ شاہ صادق کی غزل کی لوح پر "صادقی راست" لکھا ہے اور معظم کی غزل سے پہلے "جوابِ معضم (معظم)" درج ہے۔ دونوں غزلوں میں گیارہ گیارہ شعر ہیں۔

۳۔ کتب خانۂ راقم الحروف

تعداد صفحات (۲)، تعداد اشعار (۱۲)

راقم الحروف کے ہاں ایک بیاض کے چند صفحات محفوظ ہیں۔ پہلے صفحے پر ایک نثری رسالے "معراج نامے" کی چار سطریں ہیں۔ دوسرے صفحے سے سوال و جواب شروع ہوتا ہے۔

شاہ صادق کی غزل کسی عنوان کے بغیر نقل کی گئی ہے، لیکن معظم کی غزل سے پہلے "جواب سائل گوید" لکھا ہے۔

غزل کے خاتمے پر حسب ذیل عبارت ہے:

"تمت تمام شد کار من نظام شد۔ ایں سوال و جواب از دست عظمت بہ طریق یادگار نوشتہ شد۔"

تمت او ستھے کیا تمام
حق تھے حق بولیا کلام

اس نسخے میں معظم کے اشعار کی تعداد (۱۲) ہے۔ زائد شعر یہ ہے:

جب انجمن نرنکار ہوئے تجھے میسّر
گرتوں جگر کوں بریاں نقل کباب ہے یو

## ۴۔ کتب خانۂ انجمن ترقی اردو، ہند، دہلی

دیوان معظم (۷ ادواوین) میں بھی یہ غزل شامل ہے، لیکن درمیانی صفحات کے غائب ہوجانے کی وجہ سے صرف چند شعر رہ گئے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صادق کا سوال اور شاہ معظم کا جواب کسی زمانے میں بہت مقبول رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نسخے میں سوال و جواب دونوں موجود ہیں۔ ذیل میں وضاحتی اشاروں کے ساتھ یہ سوال و جواب پیش کیے جاتے ہیں۔



سوال: سائل ہوں میں عزیزاں اِس کا جواب بولو
من عرف ہور فقد کے کہتے ہیں باب بولو

جواب: سائل ہوئے عزیزاں اس کا جواب ہیلو
من عرف ہور فقد لے سب چار باب ہے یو

یعنی چار مراتب وجود: واجب الوجود، ممکن الوجود، ممتنع الوجود، اور عارف الوجود۔

سوال: کیوں سلسلہ خدا تے ہوتا ہوا ہے تن لگ
پھر تن کوں کیوں انپڑنا کاں لگ حساب بولو

جواب: ہیں نفس ہور دل، روح، سر، نور، ذات کہتے
چھے چیز سوں جسد کا سارا حساب ہے یو

بندے سے خدا تک یعنی نفس سے ذات تک پہنچنے کے لیے ان چھے مراتب سے گزرنا ضروری ہے۔ حضرت امین نے حدیث قدسی: "ان فی جسد آدم" نقل کرکے لکھا ہے۔ "ان چھ چیز سو جسد کا حساب ہے۔"

سوال: نازل کیا ہے قرآں حق سات حرف اوپر
وہ سات حرف کیا ہے کوئی شیخ شاب بولو

جواب: ی وہ سو واو، کہتے ن م ل سب مل کر
اور کاف سرحرف سو اندر نقاب ہے یو[1]

ایک آیت ہے انزل القرآن علی سبعۃ احرف کل کاف وشاف۔ ان سات حروف کی تشریح مختلف طرح سے کی جاتی ہے۔ علما عموماً سات حروف سے سبع قرات مراد لیتے ہیں۔ لیکن بعضوں نے ان سات حروف کا تعین بھی کیا ہے۔ معظم نے یہی

---

[1] آصفیہ کے نسخے میں معظم کا جواب دو شعروں میں ہے:

یو ہے سو تمنے دیکھو میم نون و کاف لام یہ ÷ ہے کاف سرحرف سو اندر نقاب ہے یو
دو یم سو واو عین ہے سین سات حرف یہ سب ÷ ان سات حرف سو قرآں نازل کتاب ہے یو

ساتھ حروف گنائے ہیں، لیکن ان کے باطن پر کوئی روشنی نہیں ڈالی۔

سوال: مجھ کوں دیکھے سو حق کوں دیکھے کہے محمد

پس کافراں بھی دیکھے پس کیا مطلب (ثواب) بولو

جواب: یک وقت پو محمد بولے تھے من رآنی

بر حق رسول سمجھے ان کو ثواب ہے یو

معظم کہتے ہیں کہ من رآنی میں رسول پر ایمان لانے کی شرط مضمر ہے۔ رسول کی بات پر یقین وہی کرے گا جو رسول پر ایمان لاتا ہے۔ اس لیے من رآنی ایمان والوں کے ساتھ خاص ہے۔ دیکھنے کو کفار بھی رسول اللہ کو دیکھتے تھے، لیکن جو رسول کو رسول ہی نہیں مانتا اس کے لیے رسول کے اندر خدا کو دیکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

سوال: دیدار خواب میانے حق اپنا دیا ہے

کیوں دیکھنا سو حق کوں تعبیرِ خواب بولو

جواب: یک وقت پر نبی نے بولے تھے لی مع اللہ

ہونا خفی میں غائب واصل کو خواب ہے یو

نبی کریم صلعم نے فرمایا تھا کہ ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ میں اللہ کے ساتھ ہوتا ہوں اور وہاں کسی فرشتے کی گنجائش ہے اور نہ نبی مرسل کی۔ شاہ معظم اسی حوالے سے کہتے ہیں کہ واصل کا اس طرح فنا ہو جانا ہی کمالِ معرفت ہے۔

سوال: دل کوں خدا عرش کر بولیا سو کیا سبب ہے

یو حل کرو مسائل کھولو کتاب بولو

جواب: دل میں ہیں سات صفتاں اس تے عرش کہا ہے

سب حل کیے مسائل بر حق کتاب ہے یو

دل، نفس، روح اور روح کے اندر سبعہ صفات ہیں۔ اسی وجہ سے دل کو عرش اللہ



کہا گیا ہے۔

سوال: پینا شراب کریوں کہ گئے ہیں سب بزرگاں

نت نوش عاشقاں کا دو کیا شراب بولو

جواب: واصل ہمیشہ پیتے اکثر سو ہے محبت

سچ عاشقاں کے حق میں یاد پیچ شراب ہے یو

کم و بیش ہر سلسلے میں عشق پر زور دیا گیا ہے۔ یہاں شراب سے مراد عشقِ الٰہی اور یادِ الٰہی کی شراب ہے۔

سوال: اسماں زمیں کے میانے الٹا کوا کتے ہیں

واصل جو آب پیتے وہ کیا ہے آب بولو

جواب: الٹا کوا کتے سو ہے ممتنع اندھارا

واصل وو آپ پیتے سو لطف آب ہے یو

خانوادۂ امینیہ میں مرتبہ ممتنع الوجود کو اندھارا گھر اور الٹا کنواں کہتے ہیں، لیکن الٹے کنوئیں کا استعارہ غور و فکر سے کھل سکا نہ کہیں اس کی تشریح نظر آئی۔

سوال: معبود عبد کے میانے کہتے ہیں عشق پردا

بن عشق تو وصل نیں یو کیا حجاب بولو

جواب: احمد میں ہور احد میں جوں میم کا ہے پردا

یوں عشق میم ہو کر دستا حجاب ہے یو

معبود سے وصل و اتصال کی آرزو ہی عبد و معبود میں غیریت پیدا کرتی ہے۔ اس لیے کہ عشق اس وقت ہوگا جب مطلوب اور طالب میں غیریت اور فصل ہوگیا۔ شاہ صادق یہ پوچھ رہے ہیں کہ وصال بغیر عشق کے ممکن ہی نہیں اور خود عشق پردا ہے۔ یہ کیا معما ہے

معظم کہتے ہیں کہ ذاتِ احد نے جب اپنے کو دیکھنا چاہا تو نزول کیا اور احمد کہلایا۔ احد،

احد ، کا طالب ہوا اور یہی عشق م بن کر احد اور احمد کے درمیان حجاب بنا۔ صوفیہ طلبِ مولا میں ترکِ دنیا، ترکِ عقبیٰ، اور ترکِ مولا بھی کرتے ہیں۔ اس لیے کہ آرزو خود حجاب بن جاتی ہے۔ شاہ صادق ترکِ مولا کے اسی مسئلے کی وضاحت چاہتے ہیں۔ لیکن شاہ معظم نے جواب کا انداز بدل دیا ہے۔ وہ عشق کے پردے کو بنی برحق حقیقت بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ احد اور احمد کے درمیان میم عشق کا پردا ہے اور یہ پردہ حقیقی ہے۔ یعنی یہ کہ حقیقت ذات باری اور حقیقتِ محمدی کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ اس لیے کہ تصوف اور فلسفہ کا ایک اصولی مسئلہ یہ بھی ہے کہ قلب ماہیت محال ہے۔ سیر فی اللہ، للہ، مع اللہ رسولِ اکرم کے ساتھ خاص سمجھی جاتی ہے۔ کسی ولی کو یہ سیر میسّر نہیں آتی، لیکن سیر کے اس کمال کے باوجود رسول اللہ نے یہی فرمایا کہ ماعرفناک حق معرفتک۔ معظم اپنے جواب میں مسئلے کے اسی پہلو کو پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ عشق کا پردا درمیان سے اٹھ نہیں سکتا۔ اولیا اللہ اس پردے کو اٹھانے کے لیے ترکِ مولا بھی کرتے ہیں اور ترکِ ترک بھی، لیکن ان سارے مراحل کے طے کرنے کے بعد بھی عبد معبود نہیں بن سکتا۔ اس لیے کہ یہ قلب ماہیت ہے اور قلبِ ماہیت محال ہے۔

سوال : نیں جانتے اچھے تو بوجنتیاں سوں جاکے پوچھو

انجان ہو رہنا سو کیا اس میں لاب بولو

جواب : فانی فی اللہ ہوے تو باقی باللہ رہتا ہے

اپروپ اس جینے کا اتنا چہ لاب ہے یو

آصفیہ کے نسخے میں شاہ صادق کا سوال تو ہے لیکن شاہ معظم کا جواب نہیں ہے۔ راقم الحروف کے مملوکہ نسخوں میں جو شعر جواب معلوم ہوتا ہے۔ وہ اوپر نقل کیا گیا ہے۔ اس شعر کا قافیہ بھی وہی ہے جو سوال والے شعر کا ہے، لیکن سوال وجواب میں کوئی ربط نہیں معلوم ہوتا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ شاہ صادق کے شعر میں کسی اہم مسئلے کے بارے میں



استفسار ہی نہیں ہے۔ ہر ایک یہی کہتا ہے کہ اگر تم نہیں جانتے تو کسی جاننے والے سے علم حاصل کرو۔ اس لیے شاہ صادق کا سوال کیا ہے، یہی واضح نہیں ہوتا۔ معظم نے جواب میں جو بات کہی ہے اس کا کوئی تعلق شاہ صادق کے سوال سے (اگر وہ سوال ہے) نہیں معلوم ہوتا۔

شاہ صادق کے سوال نامے کا آخری شعر یہ ہے :

شیوخ ظاہری سب شہرت اُٹھائے ہیں کر

سائل ہوا ہے صادق سُن کو جواب بولو

اور معظم کا جواب حسبِ ذیل ہے :

قادر رحم کرم کر بولیا منجے معظم

صدقہ امین علی کا تجہ پر خطاب ہے یو

شاہ صادق آخر میں کہتے ہیں کہ لوگ بڑے بڑے شیوخ اور زاہد بنے بیٹھے ہیں، ان میں سے کوئی تو میرے سوالوں کا جواب دے۔ اس طرح شاہ صادق دعوتِ مبارزت کے انداز میں گویا صلائے عام دے رہے ہیں۔ آصفیہ کے نسخے میں شاہ صادق کے آخری شعر سے پہلے ایک اور شعر ہے جو راقم الحروف کے نسخوں میں نہیں ہے :

قادر ہوا ہے شہرت لے کر اٹھا ہے یوں کر

کوئی حل کرو مسائل اس کا جواب بولو

اس شعر کا پہلا مصرع صاف نہیں ہے تاہم یہ مطلب سمجھ میں آتا ہے کہ جو لوگ قادر کی بزرگی اور اُن کے فیضان کا بار بار ذکر کرتے ہیں وہ ہمارے سوالوں کا جواب دیں، تو ہم بھی مانیں یا پھر راست قادر (قادر لنگا کوتال) سے مخاطبت بھی ہو سکتی ہے۔

معظم نے اپنے جواب میں نہ تو تعلی کی ہے اور نہ مبارزت طلبی کا جواب دیا ہے، جس سے ان کے مزاج اور افتادِ طبع کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ حسبِ عادت آخری شعر میں اپنے شیخ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ قادر نے میرے حال پر رحم کر کے مجھے معظم کے نام سے سرفراز کیا ہے اور

یہ صدقہ امین علی کا ہے۔

## بازیافت

سوالِ صادق اور جوابِ معظم کا ایک اور نسخہ (۱۶۹ فلسفہ) کتب خانۂ آصفیہ میں دست یاب ہوا ہے، جس میں صادق اور شاہ معظم کے اشعار کی تعداد (۳۳) ہے۔

اس نسخے کی کتابت کا انداز بھی بدلا ہوا ہے۔ دوسرے تمام نسخوں میں صادق کی غزل (سوالات) پہلے اور شاہ معظم کی غزل (جوابات) اس کے بعد نقل کی گئی ہے، لیکن اس نسخے میں سوالات اور جوابات کو الگ الگ لکھنے کی بجائے ہر سوال کے ساتھ اس کا جواب لکھا گیا ہے۔

کتب خانہ آصفیہ کے نسخے (۲۷۵۹ جدید) میں صادق کے اشعار کی تعداد بارہ اور شاہ معظم کے اشعار کی تعداد گیارہ ہے۔ راقم الحروف کے مملوکہ نسخوں میں سے ایک میں صادق اور معظم کے اشعار کی تعداد گیارہ گیارہ ہے اور دوسرے نسخے میں صادق کے اشعار گیارہ اور معظم کے اشعار کی تعداد بارہ ہے۔ صادق اور معظم کے بارھویں شعر کی نشان دہی پچھلے صفحات میں کی جا چکی ہے۔ زیرِ نظر نسخے میں صادق کے اشعار کی تعداد گیارہ ہے اور معظم کے اشعار کی تعداد بائیس ہے، جن میں راقم الحروف کے دوسرے نسخے کا بارھواں شعر بھی شامل ہے۔ اس طرح زیرِ نظر نسخے میں دس شعر ایسے ملتے ہیں جو کسی دوسرے نسخے میں نہیں ملتے۔

دوسرے نسخوں میں سوال بھی ایک شعر میں ہے اور جواب بھی ایک شعر میں دیا گیا ہے۔ صرف آصفیہ کے نسخے میں ایک جواب دو اشعار میں ہے، لیکن زیرِ نظر نسخے



میں بعض جواب ایک شعر میں، بعض دو شعر میں اور بعض تین شعر میں دیے گئے ہیں۔ ان زائد اشعار سے جواب زیادہ واضح ہو گئے ہیں۔

اس نسخے میں بعض دوسرے نسخوں کی طرح، سوال و جواب کی ترتیب بھی بدلی ہوئی ہے، لیکن ہر نسخے کی یہ مشترک خصوصیت ہے کہ سوال جس ترتیب سے نقل ہوئے ہیں جواب بھی اسی ترتیب سے نقل کیے گئے ہیں۔

# سی حرفی

چند اصنافِ سخن دبستانِ دکھن کے ساتھ مخصوص ہیں۔ ان میں چکی نامہ، سہیلا، حقیقت کھاڑا اور سی حرفی قابلِ ذکر ہیں۔ سی حرفی وہ نظم ہے، جس کا ہر مصرع یا ہر شعر ترتیب وار حروفِ تہجی کے نام سے شروع ہوتا ہے اور جس حرف کے نام سے مصرع یا شعر شروع ہوتا ہے وہی اس مصرعے یا شعر کے پہلے لفظ کا پہلا حرف بھی ہوتا ہے۔ کبھی کبھی حروفِ تہجی کے نام کو حذف بھی کر دیا جاتا ہے اور صرف یہ التزام رکھا جاتا ہے کہ ہر مصرعے کے پہلے لفظ کا پہلا حرف، حروفِ تہجی کی ترتیب کے ساتھ آتا جائے۔

سی حرفی بالعموم مثنوی کی ہیئت میں ملتی ہے، لیکن بعض نظمیں ترجیع بند اور ترکیب بند کی ہیئت میں بھی لکھی گئی ہیں، جو نظمیں ان ہیئتوں میں لکھی گئی ہیں، اُن میں ہر بند کا پہلا مصرع ترتیب وار نئے حرف سے شروع ہوتا ہے۔

عربی حروفِ تہجی اگرچہ (۲۸) ہیں، لیکن خانوادۂ برہانیہ کے صوفیہ نقطہ اور لا کو بھی بہ طور حروف شامل کر کے تعدادِ حروف کو تیس تک پہنچاتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کے نظامِ فکر میں نقطے اور لا کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور بغیر ان کے حروفِ تہجی کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ نقطے اور لا کی یہ اہمیت اور فضیلت شاہ برہان الدین جانم کی تعلیمات کا حاصل ہے۔ چناں چہ شیخ محمود خوش دہاں رسالۂ معرفت السلوک میں



ان تعلیمات کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اے سالک بداں کہ دریں اصطلاح مرتبۂ حرفِ لام الف از مرتبۂ بعضے حروف ہا بالاتر است و ایں حرف لاتعریفِ نقطہ می کند و مدحِ نقطہ می گوید کہ چہ لطافتی و ظرافتی است۔ مر نقطہ را کہ ہیچ حروفِ مفردات خواہ مرکبات در روئے اظہار نیستند و مخفی اند بقابلیات کہ اخراجِ حرفات ازاں قابلیات است بلکہ آں قابلیات در نقطہ عین نقطہ است بلکہ دراں حال قابلیت را نیز ہیچ وجودے نیست بجز وجود نقطۂ لاتعین پس ایں حروف لا از تعین نقطہ گواہی می دہد کہ بجز نقطہ ہیچ تعینی نیست یعنی ذات نقطہ بالوجود خود خواست۔"[1]

"حرف لا در ازل کلام حق بود بہ معنی آنکہ نیست بجز من ہیچ کس ازیں معنی دو حرف لا را لام الف ثبوت کردن و بہ معنی نفی۔ بنا بر آں آنحضرت پیر دستگیر ما قدس اللہ سرہ العزیز حرف لا را بر جملہ حرفہا منسوب کردند"[2]

"..... پس آنحضرتِ ما حرف لام الف را بنا بر آں بر سر جملہ حروفات نوشتہ اند....."[3]

"پس بدانکہ چو اصطلاحِ وجود حروفات کہ بست و ہشت اند ظہورِ ایشاں را جملہ از نقطہ دیدند و نقطہ را از جملہ منزہ یافتند۔"[4]

شاہ برہان الدین جانم نے حروفِ تہجی کو چار وجودوں پر تقسیم کر کے ہر وجود کے ساتھ

---

[1] شیخ محمود خوش دہاں، رسالۂ معرفت السلوک، مخطوطہ، مملوکہ راقم الحروف

[2] شیخ محمود خوش دہاں، رسالۂ معرفت السلوک، مخطوطہ، مملوکہ راقم الحروف

[3] شیخ محمود خوش دہاں، رسالۂ معرفت السلوک، مخطوطہ، مملوکہ راقم الحروف

[4] شیخ محمود خوش دہاں، رسالۂ معرفت السلوک، مخطوطہ، مملوکہ راقم الحروف

حروف بتائے ہیں۔ اس تقسیم کی وضاحت کرتے ہوئے محمود خوش دہاں نے لکھا ہے:

"اے سالک کہ کلام حق بہ ایں حروفات در اظہار آمد ہمیں معنی بود کہ جملہ کلام سبحانہٗ با بست و ہشت حروف تمام گشت۔ چناں چہ ظہورِ قران خارج ازیں بست و ہشت حروف نیست۔ ہم چنیں ظہورِ عالم خارج از بست و ہشت مراتب نیست۔ چناں چہ در دائرہ جامِ جہاں نما نوشتہ است وایں مراتب عالم کتابِ اعظم اوست۔ چناں چہ مولانا مغربی گفتہ:

عالم بخط دوست کتابیست ولیکن
ادراک وروی نہ کند دیدۂ اعمیٰ

پس ذاتِ آں سبحانہ در ظہورِ خود بہ بست و ہشت مرتبہ نمودہ می آید باوجود چہار۔ در اصطلاحِ آں حضرت ما قدس اللہ سرہ العزیز بست و ہشت حروف را بہ تقسیم چہار وجود کردہ اند بہ ہفت حروف پس آں ہفت حروف اولین کہ از الف تا خی اند در دائرہ عارف الوجود ثابت کردہ شدہ است۔ زیراکہ در دائرہ عارف الوجود ہفت مرتبہ اند بجز حروف لا۔ ہفت حروف اولین را در تقسیم عارف الوجود کردہ ہفت حروف دومی را بہ قسمت بہ ممتنع الوجود، و ہفت سومی را بہ ممکن الوجود، و ہفت حروف چہارمی را بہ لازم الوجود آں چناں کہ اگرچہ در دائرہ واحد الوجود نیز بجز لا ہفت مراتب اند، اما آں در تحت لا اند۔ پس در ہر دائرہ ہر ہفت حروف کہ در آں دائرہ اند دلالت آں بر آں مرتبہ می کنند تا حرف ی کہ آخر مراتب است۔"[1]

اس طرح (۲۸) حروف کو چار مراتب پر تقسیم کر کے ہر حرف کا ایک شغل متعین کیا ہے
مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ سی حرفی میں اٹھائیس حروف

[1] شیخ محمود خوش دہاں، رسالہ معرفت السلوک مخطوط مملوکہ راقم الحروف۔



کے علاوہ نقطہ اور لا کو کیوں شامل کیا جاتا ہے اور اُن کی کیا اہمیت ہے۔ ان حروف کا خانوادۂ امینیہ میں کیا مفہوم ہے اور ان کے نظامِ تصوف میں وہ کیا مقام رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ اس کے بغیر نظم سی حرفی کی اصطلاح سمجھ میں آ سکتی ہے، نہ اس کی ہیئت کا اندازہ ہو سکتا ہے، نہ اس کے مخصوص مفاہیم تک ذہن منتقل ہوتا ہے اور نہ ہیئت اور مضمون کے گہرے ربط پر نظر جا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ صنف اب تک ایک معما بنی رہی اور کسی نے اس کی ہیئت، اصل، موضوع اور مضامین کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں لکھا ہے۔

اس صنف میں بعض ایسی نظمیں بھی ملتی ہیں جن میں پ، ٹ، چ اور ڈ کو شامل کر کے حروف کی تعداد (۳۴) تک پہنچا دی گئی ہے۔ ایسی نظمیں محض جدتِ طبع کی پیداوار معلوم ہوتی ہیں۔ اس لیے کہ یہ صنف ایک مخصوص نظامِ فکر کی پیداوار ہے، اشعار کی تعداد میں تو کمی بیشی ہو سکتی ہے لیکن حروف کی تعداد میں کمی بیشی سے وہ نظامِ فکر ہی درہم برہم ہو جاتا ہے، جس نے اس کو جنم دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن شعرا نے، جن کا تعلق خانوادۂ امینیہ سے ہے، کبھی حروف کی تعداد میں اضافہ نہیں کیا ہے، البتہ ایسی نظمیں ضرور ملتی ہیں، جن میں صرف اٹھائیس حروف ہیں نقطہ اور لا کو حذف کر دیا ہے، لیکن اس سے نظم کی معنویت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اس لیے کہ ان نظموں میں واجب الوجود سے عارف الوجود تک بیان پر اکتفا کیا گیا ہے، واحد الوجود اور اس کے آگے کے مرتبے پر طبع آزمائی نہیں کی ہے۔

قرائن سے پتا چلتا ہے کہ یہ صنف شاہ برہان الدین جانم کی دین ہے۔ ارشاد نامے کے آخری حصے میں اس صنف کے ابتدائی خط و خال کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے ارشاد نامے میں علم کسبی اور علم لدنی کے فرق کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

علم لدنی نکتہ جان ؛ وہی ہے نکتہ دیکھ پچھان
ایسا نکتہ وہ ہے بار ؛ ظاہر باطن دیکھن ہار

ہریک حرفوں نکتہ جان ؛ ناؤں نشان تو ہوئے عیاں
بن حرف نکتہ کہاں ہے ٹھار ؛ بن نکتہ حرف کہاں ہے بار
کر اول نکتہ الف سیر ؛ رکھ کر نکتہ کھینچے گیر
وہ تو نکتہ احد ئیک ؛ ب کا نکتہ محمد دیک
ت کا نکتہ مرید مرار ؛ باویس نکتہ کروں سواد[1]

اسی طرح ث ، ح ، خ ، ف ، ق ، ع ، ش ، ن اور ی کی وضاحت کی ہے ، لیکن اس وضاحت میں نہ تو پورے حروفِ تہجی شامل ہیں اور نہ ترتیب کا خیال رکھا گیا ہے بعض حروف کی وضاحت ایک سے زاید بار بھی کی ہے ۔ اگرچہ جانم نے پورے حروف تہجی کی تشریح نہیں کی ہے ، لیکن حسب ذیل شعر سے صاف ظاہر ہے کہ تمام حروف تہجی کے مفاہیم ان کے ذہن میں تھے :

نکتے کا ہے دیک حرف ؛ یک کم تیس حرف

کلمۃ الحقائق میں بھی حروفِ تہجی کی بحث علم کسبی اور علم لدنی ہی کے سلسلے میں آئی ہے ۔

" علم دو است ، یکے کسبی ، دوم علمِ لدنی ، د علمِ کسبی چیزے کہ در قلم درآید وعلمِ لدنی کہ در قلم نیاید ، آں علمِ لدنی ۔ چناں چہ العلم نقطۃ ، آں نکتہ کدام است ۔ ذاتِ منزہ باری تعالیٰ کہ عالم الغیب والشہادت ، آں نکتہ قدیم است کہ از نکتہ او ہمہ نکات باز آمدند ۔ بر حروف تمام تا نام ونشاں عیاں شد کہ ہمہ قدرت آشکارا شد ۔ جان و جہانیان تمثیل نظیرہا نمود ۔ چناں چہ نکتہ ابتدا از الف است کہ عالم الغیب والشہادت ، و از نکتہ احد نکتہ ب احمد شد کہ من رانی فقد رای الحق و نکتہ ت از ب

---

[1] شاہ برہان الدین جانم ، ارشاد نامہ (مرتبہ ڈاکٹر زور) صفحہ ۱۵۳



مرید است ..... "[1]

اسی طرح ث ، ج ، خ ، ذ ، ز ، ش ، ض ، ظ ، ع ، غ ، ف ، ق اور ی کی تشریح کرتے گئے ہیں ۔ اسی سلسلے میں لکھا ہے :

" اما نکتہ بر ہمہ جا باشد یکی مخفی و یک جا اظہار کہ ہو الظاہر ہو الباطن ولیکن جز نکتہ یک کم سی حرف بار نمود ولیکن نکتہ منزہ است ۔"[2]

ارشاد نامے اور کلمۃ الحقائق میں تو پورے حروف تہجی کی تشریح نہیں ملتی لیکن جانم نے اپنی ایک نظم[3] میں اس کا اہتمام کیا ہے ، غالباً یہی اس ڈھنگ کی پہلی نظم ہے ۔ یہ نظم (۱۶) ابیات پر مشتمل ہے ۔ پہلے شعر کا پہلا مصرع نکتے سے اور دوسرا مصرع الف سے شروع ہوتا ہے :

نکتا ہو کر جب لگ تھا تب لگ نہ تھا بیاں
الف اس نکتے تے ہو بیٹھا دسنے لا گیا عیاں

چودہ شعروں تک یہی التزام رکھا ہے کہ ہر مصرع ایک حرف سے شروع ہوتا ہے ، لیکن پندرھویں شعر کا دوسرا مصرع "ی" سے شروع ہونے کی بجائے سولھویں شعر کا پہلا مصرع "ی" سے شروع ہوتا ہے ۔ پندرھواں اور سولھواں شعر حسب ذیل ہے ۔

لا کا لٹکا دیکھیں تو تجہ لٹکا تھاوے
اس لٹکے میں جے کوئی لٹکے درسن سوہی پاوے

ی یقین یہاں جس ہوے وہاں بھی یقین جان
والسلام میں ان کو گنتا جے پُر نور ایمان

---

[1] شاہ برہان الدین جانم ، کلمۃ الحقائق (مرتبہ ، اکبر الدین صدیقی) صفحہ ۱۰۸

[2] شاہ برہان الدین جانم ، کلمۃ الحقائق (مرتبہ ، اکبر الدین صدیقی) صفحہ ۱۱۰

[3] یہ نظم کتب خانۂ انجمن ترقی اردو ، ہند ، دہلی کے ایک مجموعۂ رسائل (۵۴ تصوف) میں شامل ہے ۔

مولوی عبدالحق نے شاہ برہان کی منظومات میں اسی ڈھنگ کی دو نظموں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے ایک "نکتۂ واحد" ہے اور دوسری کا کوئی عنوان نہیں ہے۔ ان نظموں کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

یہ نظم بارہ شعر کی ہے، جس میں توحید کی تلقین ہے اور ہر حرف ابجد سے کوئی لفظ بنا کر ہدایت فرمائی ہے۔ پہلا شعر یہ ہے:

نکتہ واحد اپیں احد ہے الف ذات اللہ صمد ہے
ب بہ روپ کر آپیں ایک ت تمام پرگٹ لیکھ
(بہروپ)

اسی طرح "ی" تک لکھتے چلے گئے ہیں۔

اسی کے ساتھ دوسری نظم بھی اسی قبیل کی ہے۔ اس میں بھی ہر شعر کی ابتدا میں حرف ابجد ہے اور اس سے لفظ لے کر شعر کہا ہے، مثلاً:

الف ایمان اللہ پر لیاؤ اُن سب جگ نپایا
الیسی قدرت یہ بھانت دچیا آپیں، آپ چھپایا
ز زینت دنیاں کا چھوڑیں زحمت جاوے نھاس
زیارتی توہت نہ آدیے نیاں انپڑے پاس

اس میں کُل اُنیس شعر ہیں۔ عربی حروفِ ابجد اٹھائیس ہیں۔ لیکن آخر میں ایک شعر "پ" کا اور بڑھا دیا ہے۔ وہ یہ ہے:

پ پوراتے طالب ہوے پر نور اس کا دل
پاک پر شاہ برہان آکھے پیارے حق کا داخل[1]

---

[1] رسالہ اردو بابت ماہ جولائی ۱۹۲۷ء صفحہ ۵۲۴۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ "پ" سے شروع ہونے والا شعر الحاقی ہے۔



ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولوی عبدالحق سی حرفی کی صنف سے واقف نہیں تھے۔ اس لیے انھوں نے نہ تو ان نظموں کو "سی حرفی" کا نام دیا ہے اور نہ اس صنف کے بارے میں کچھ لکھا ہے۔

افسر صدیقی نے شاہ برہان کی ایک اور سی حرفی کا ذکر کیا ہے جو ترجیع بند کی ہیئت میں کہی گئی ہے:

اس سی حرفی کا نام فہرست مخطوطات میں "گفتارِ شاہ برہان" لکھا گیا ہے۔ شاہ برہان نے اپنی سی حرفی کو ترجیع بند کی صورت میں لکھا ہے۔ کل (۱۲) بند اور (۴۹) مصرعے ہیں۔ ہر بند کے آخر میں ایک مصرع

پیا نکتہ پرگٹ آج بھیا

کی تکرار ہے۔ خاص بات اس سی حرفی میں یہ ہے کہ "الف" آخری بند میں ہے "ب" سے ابتدا کی گئی ہے اور "لا" کو ایک حرف تصور کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ایک بند لکھا جاتا ہے:

ج جیو بس میرے تو نیں بسے ۔ ح حاصل مرشد باج کسے
خ خلوت میں توں آپ دسے ۔ پیا نکتہ پرگٹ آج بھیا[1]

شاہ برہان کی پیروی میں ان کے سلسلے کے اکثر شاعروں نے سی حرفی کہی ہے، جن میں شیخ محمود خوش دہان[2]، شاہ کریم[3]، شاہ معظم[4]، شاہ تراب[5] اور شاہ کمال[6] قابلِ ذکر ہیں۔

---

[1] رسالہ اردو بابت اپریل ۱۹۶۱ء صفحہ ۲۹
[2] مخطوطہ کتب خانہ راقم الحروف
[3] مخطوطہ کتب خانہ درگاہ امین الدین علی اعلیٰ، بیجاپور
[4] شاہ معظم کی اس نظم کے نسخوں کی تفصیل آگے آئے گی۔
[5] شاہ تراب کی یہ نظم ان کے دوسرے کلام کے ساتھ کتب خانہ انجمن ترقی اردو ہند دہلی میں محفوظ ہے۔
[6] کتب خانہ راقم الحروف

شاہ برہان کی زندگی ہی میں یہ صنف بہت مقبول ہو گئی تھی۔ اور گجری اور برج کے صوفی شعرا نے بھی اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ چناں چہ گجری کے صوفی شاعر شاہ علی جیو گام دھنی (م ۹۷۳) کی بھی ایک سی حرفی ملتی ہے۔ پروفیسر نجیب اشرف ندوی نے اس نظم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

علی جیو گام دھنی نے ایک سی حرفی بھی لکھی ہے اور شاید اردو میں اس کی اولیت کا سہرا انھیں کے سر ہے۔ اس کے چند شعر یہ ہیں:

عین گسائیں غین کہایا ؛ نانوں کا آپس ٹمکا دینا

آپیں آپس ستیں سائیں غمزے کے تائیں نکتا کیتا (!)

ایک الف بے تے ہو آیا رلے ؛ سیوٹ ہو آپ بچایا

حرف حرف میں لٹکا لایا

جیم جنت ہو بیچ سولیایا ؛ ح حوراں ہو آپ دکھایا

آپ شراب طہور پلایا[1]

کتب خانۂ آصفیہ میں وجہن کی ایک سی حرفی (تصوف شاملات ۵۳) محفوظ ہے۔[2] یہ نظم چھ چھ مصرعوں کے اٹھائیس بندوں اور گیارہ صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر بند کا پہلا مصرع نئے حرف سے شروع ہوتا ہے۔ شاعر نے ہر بند کے آخری شعر میں اپنا تخلص "وجہن" لایا ہے۔ ترقیمے میں میاں وجہن شاہ لکھا ہے۔ نظم کا کوئی عنوان نہیں ہے۔

---

[1] علی گڑھ: تاریخ ادب اردو صفحہ ۱۱۱

[2] اس نظم کے دو مطبوعہ نسخوں کا ذکر قاموس الکتاب میں نمبر ۵۶۸ اور نمبر ۱۰۴۸۹ پر ملتا ہے۔ اول الذکر نمبر کے تحت نظم کا عنوان الف پائے وجہن اور ثانی الذکر کے تحت الف بائے وجہن درپن لکھا ہے۔



ترقیمے سے پتا چلتا ہے کہ یہ نظم مطبع علوی سے چھپ چکی ہے۔[1] زیرِ نظر نسخہ اسی کی نقل ہے جس کو اشرف علی ولد یوسف علی نے علی آباد پرگنہ ادونی دریا باد صوبہ اودھ میں ۲۶ محرم سنہ ۱۲۸۳ ہجری کو نقل کیا ہے۔

شاہ وجہن کی زبان برج ہے۔ حسب ذیل اشعار سے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:

الف ایک بھو رنگی سائیں ؛ پر گھٹ مارا وہ کی پرچھائیں

جہاں دیکھو تہاں روپ ہے نیارا ؛ ایسا وہ بھو رنگی پیارا

وجہن کہیں تو کیا کہیں کہنے کی نہیں بات

سمندر سمایو بوند میں یہ اچرج بڑا دیکھات

ب بن گرو کوئی بھید نہ پاوا ؛ دھرتی سے آکاس لو دھاوا

پہلی پیت گرو سے کرے ؛ پریم ڈگر میں پگ تب دھرے

بن گرو وجہن جو کوئی لیت ہے بس رنگائے

یہ تم سچ کی جانیو وہ دوو اور سے جائے

افسر صدیقی نے بھی وجہن کی اس نظم کا ذکر کیا ہے، اُن کے پیشِ نظر اس نظم کا جو نسخہ رہا ہے اُس میں بندوں کی تعداد (۳۰) ہے۔

شاہ محمد غوث چشتی صابری نے بھی اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ افسر صدیقی نے اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ شاہ غوث نے پ، ٹ، چ اور ڈ کا اضافہ کر کے تعداد حروف (۳۴) تک پہنچائی ہے اور (۳۵) بند کہے ہیں۔ ہر بند میں چار چار

---

[1] یہ نظم مطبع نول کشور سے ۱۸۷۷ء میں (قاموس الکتاب صفحہ ۵۸۶) شاہ کریم کی مثنوی کے ساتھ کانپور سے سنہ ۱۲۶۲ ہجری میں، اور سید امام الدین مولف برکات الاولیا کے زیر اہتمام چار اور رسالوں کے ساتھ "سراج الفقرا" کے نام سے سنہ ۱۳۲۴ ہجری میں چھپ چکی ہے (رسالہ اردو، پاکستان، بابت اپریل سنہ ۱۹۶۶ صفحہ ۳۰)

شعر ہیں۔

شاہ معظم خانوادۂ امینیہ کے سربرآوردہ شاعر ہیں۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ اپنے خانوادے کی اس مخصوص صنف میں طبع آزمائی نہ کرتے۔ چناں چہ انھوں نے بھی سی حرفی کہی ہے، جس کے نسخے اکثر کتب خانوں میں مل جاتے ہیں۔ راقم الحروف کو جو نسخے دست یاب ہو سکے ہیں، اُن کی تفصیل درج ذیل ہے:

### ۱۔ کتب خانۂ ادارہ ادبیاتِ اردو، حیدرآباد

مخطوطہ نمبر (۵۱۷)، تعداد صفحات (۵)، تعداد اشعار (۲۸)۔

یہ نسخہ حضرت امین کے ملفوظات اور اذکار و اشغال کے ساتھ ایک مجموعے میں شامل ہے جو انتہائی کرم خوردہ اور بوسیدہ ہے۔ اس نسخے کی خصوصیت یہ ہے کہ ہر شعر کے نیچے ایک آیت، حدیث یا قول نقل کیا گیا ہے۔ اکثر ابیات کا مطلب وہی ہے جو ان کی ذیل میں دی ہوئی آیت، حدیث یا قول کا ہے، لیکن بعض جگہ یہ معنوی ربط مفقود بھی ہے۔ مثنوی کا عنوان درج نہیں ہے، لیکن شاعر کا تخلص اور اس کے شیخ کا نام موجود ہے۔

### ۲۔ کتب خانۂ ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد

مخطوطہ نمبر (۶۷۷)، تعداد اشعار (۲۰)، تعداد صفحات

یہ نسخہ ایک بیاض میں شامل ہے جو سنہ ۱۱۲۱ ہجری کی مکتوبہ ہے۔ اس بیاض میں دکن کے اُن شعرا کا کلام درج ہے جو گول کنڈہ اور بیجاپور کے زوال کے زمانے میں گزرے

یہ نسخہ ناقص الآخر ہے۔ کاتب نے 'ف' کے شعر پر مثنوی ختم کر دی ہے، عنوان

سی حرفی لکھا ہے۔



### ۳۔ کتب خانۂ آصفیہ، حیدرآباد

مخطوطہ نمبر (۱۸۲۶) جدید، تعداد صفحات (۲)، تعداد اشعار (۳۰)

لوح پر بسم اللہ الرحمن الرحیم کے بعد "حضرت امام علی موسیٰ رضا رسالہ معظم شاہ" لکھا ہے۔ عنوان درج نہیں ہے۔

### ۴۔ کتب خانۂ آصفیہ، حیدرآباد

مخطوطہ نمبر (۱۱۷۴) تصوف، تعداد صفحات (۵)، تعداد اشعار (۲۹)

ایک ضخیم بیاض میں، جس کا شیرازہ بکھر چکا ہے، یہ مثنوی شامل ہے۔ سرنامہ اور ترقیمہ نہیں ہے۔ ادارہ ادبیات کے نسخے (نمبر ۵۱۷) کی طرح اس نسخے میں بھی ہر شعر کے نیچے کوئی حدیث، آیت یا قول درج ہے

### ۵۔ کتب خانہ نواب سالار جنگ، حیدرآباد

مخطوطہ نمبر (۱۴۹) تصوف، تعداد صفحات (۲)، تعداد اشعار (۳۰)۔

آزاد نامہ، گفتارِ معظم، قصیدۂ معظم اور وصیت الہادی کے ساتھ یہ مثنوی شامل ہے اور آزاد نامے کے بعد 'الف نامہ' کی سرخی کے تحت لکھی گئی ہے۔ غالباً نصیر الدین ہاشمی مرحوم نے یہ عنوان نہیں دیکھا، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے "الف نامے" کے خاتمے کے اشعار کو آزاد نامے کے خاتمے کے اشعار بتایا ہے[1]

---

[1] کتب خانۂ نواب سالار جنگ کی اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست، صفحہ ۲۰۰

### ۶۔ کتب خانۂ پروفیسر آغا حیدر حسن، حیدر آباد

تعداد صفحات (۵)، تعداد اشعار (۳۰)

یہ نسخہ ایک قدیم بوسیدہ اور کرم خوردہ بیاض میں شامل ہے، جس کے اکثر اوراق ایک دوسرے کے ساتھ پیوست ہو گئے ہیں۔ مثنوی کا کوئی عنوان درج نہیں ہے۔

### ۷۔ کتب خانۂ قادر بادشاہ صاحب، حیدر آباد

تعداد صفحات (۳)، تعداد اشعار (۳۰)

لوح پر کلام معظم لکھا ہے۔ کوئی ترقیمہ نہیں ہے، البتہ سنہ کتابت ۱۲۶۰ھ ہجری درج ہے۔

### ۸-۹-۱۰، کتب خانۂ انجمن ترقی اردو، ہند، دہلی

کتب خانۂ انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، میں اس مثنوی کے تین نسخے ہیں۔ پہلا نسخہ مخطوطہ نمبر (۷۵) تصوف میں، دوسرا نسخہ مخطوطہ نمبر (۷۶) تصوف میں اور تیسرا نسخہ دیوان معظم (مخطوطہ نمبر ۱۷ دواوین) میں شامل ہے۔ نظم کا عنوان کسی نسخے پر درج نہیں ہے۔ فہرست نگار مخطوطات انجمن ترقی اردو نے "مثنوی معظم (حروف تہجی)" کا نام دیا ہے[1] پہلے اور دوسرے نسخے میں اشعار کی تعداد (۲۹) اور تیسرے نسخے میں (۳۱) ہے۔

### ۱۱۔ کتب خانۂ پروفیسر نجیب اشرف ندوی، بمبئی

تعداد صفحات (۲ ½)، تعداد اشعار (۲۹)

کلمۃ الاسرار، چھ سر ہار وغیرہ کے ساتھ ایک مجموعے میں سی حرفی کا یہ نسخہ بھی شامل ہے۔

---

[1] رسالۂ اردو ادب بابت جون ۱۹۵۳ء، صفحہ ۱۴۱



سرنامہ اور ترقیمہ نہیں ہے۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھ کر مثنوی نثر کی طرح نقل کی ہے۔ کم و بیش ہر شعر کے بعد ادارۂ ادبیات اردو (مخطوطہ نمبر ۱۵۷) اور کتب خانہ آصفیہ (۱۷۱۱ تصوف)، کے نسخوں کی طرح کوئی آیت، حدیث یا قول درج کیا گیا ہے۔ کہیں کہیں فارسی جملے اور فقرے بھی ہیں۔

اس مجموعے کے تمام رسائل ایک ہی کاتب کے لکھے ہوئے ہیں۔

### ۱۲۔ کتب خانۂ انجمن ترقی اُردو، پاکستان

اس نسخے کا ذکر افسر صدیقی نے اپنے مضمون "سی حرفی معظم" میں کیا ہے اور اس کو رسالۂ اردو (پاکستان) بابت اپریل ۴۶ء میں چھاپ دیا ہے۔ تعداد اشعار (۳۰) ہے۔

اس مثنوی کے صرف (۳) نسخوں پر عنوان درج ہے۔ نسخۂ نمبر (۷۷۶) ادارۂ ادبیات اردو پر "سی حرفی"، نسخۂ (۱۴۹) تصوف کتب خانۂ نواب سالار جنگ پر "الف نامہ" اور نسخۂ کتب خانۂ قادر بادشاہ پر "کلام معظم" لکھا ہے۔ کلام معظم غالباً کاتب نے اپنے طور پر لکھ دیا ہے۔ یہ مثنوی کا عنوان نہیں ہو سکتا۔ اب رہ گئے دو عنوان "سی حرفی" اور "الف نامہ"، چوں کہ یہ نظم اس صنف سے تعلق رکھتی ہے جس کو "سی حرفی" کہا جاتا ہے اس لیے اس کا عنوان "سی حرفی" بھی ہو سکتا ہے، لیکن اس عنوان کی حیثیت عمومی ہے جس سے صنف متعین ہوتی ہے۔ اس لیے قیاس ہوتا ہے کہ اس عمومیت میں تخصیص پیدا کرنے کے لیے شاہ معظم نے "الف نامہ" کا عنوان دیا ہوگا۔ اس قیاس کو تقویت اس سے بھی ہوتی ہے کہ مثنوی "نقطے" سے نہیں "الف" سے شروع ہوتی ہے۔

سی حرفی کے موضوع اور مضامین کے بارے میں ابتدائی سطور میں اظہار خیال کیا جا چکا ہے اس لیے زیر نظر نظم کا موضوعاتی جائزہ تحصیل حاصل ہے۔ ذیل میں پوری

مثنوی نقل کی جاتی ہے

الف احد میں مخفی تھا سو شوقوں باہر آیا
حرف حرف میں روپ بدل کر میم کا گھونگھٹ لایا

ب باندیا رشتہ روز ازل سوں عشق محبت گل میں
جن کوں حق کا ہیم پیارا عاشق ہوتے پل میں

ت تعلیم جنوں کوں یہی دیتا اُن کا شوق بندھارا
من عرف کر حق کوں پاوے عارف عاشق سارا

ث ثانی اُس کا کوئی نہیں ایک وہی ہے رازق
رحم کرم اُس کا سب پر دو جگ کا ہے خالق

ج جمالت یوسب اُس کا جو کچھ تج کوں دستا
اول آخر، ظاہر باطن، کیا خالی کیا بستا

ح حق کو سمجھو جو کچھ دیکھو مطلق اُس کو کہتے
واصل حق سوں قائم دائم ہل مل کر یوں اچھتے

خ خبر لو اُن سوں پانا جن کوں پیر کیا ہے
تج گنج کیرا پور خزانا جن کے ہات دیا ہے

د دلیل یو حق نے تجھ پر قائم حجت بھیجا
یہاں اندھا سو واں اندھا ہے رویت تخنے لے جا

ذ ذاکر اچھنا ہر دم، ذکر فکر میں رہنا
شاہد مشہود ہو کر رہتے واصل اُن کو کہنا

ر راضی رہنا حق پر اپنے، صابر ہو کر شاکر
خیر شر سب اس سوں جانو نیں تو ہونا کافر



ز زینت تیرا بندگی طاعت و وسوں شرع محمدؐ
فرض کیا ہے حق نے تجھ پر بولے آپ محمدؐ

س سلوک کی راہ دکھاتے اُن کوں کہتے سالک
چاروں منزل طے کراتے اُن کوں کہتے مالک

ش شہادت چاروں تن سوں چاروں کو بوجے
باٹ پرت کی مفت نہیں رے مرو مر کوں بوجے

ص صابر رہنا جور و جفا پر تسلیم ہو کر دائم
عاشق صادق اس کو کہتے عہد الست پر قائم

ض ضرب تو دیتے رہنا نفس وندے کوں ہردم
مجاہدے سوں کوشش کرنا تو کیا ہے اس کا غم

ط طالب صادق اچھنا تو توں مطلب پاوے
صادق کو ہے راحت کہتے کاذب کھویا جاے

ظ ظلم توں اُس پر کرنا جس پر آیا حد
دشمن تیرا نفس امارہ اُس کوں کرنا رد

ع عنایت حق نے کیتا تجھ پر دین نبی کا
چاروں رہ چل کو جانا جیوں ہے امر ربی کا

غ غزا پر قائم اچھنا دائم چڑکر تازی
تجرید ہو کر تفرید رہتے ان کو کہتے غازی

ف فاقہ لینا تن پر اپنا دینا فنا میں اول
چالیس چالیس فاقے کرتے نبی ہمارے مرسل

ق قناعت بڑا خزانہ جن کوں حق آپی دیتا
دو عالم کوں نیں خاطر لیا تے اُن کوں مالک کیتا

ک کفر کا پردہ توڑو جو دیکھو چاند پنم کا
اوس کے نینوا دس کوں دیکھو کھول گھونگھٹ میم کا
(منیم)

ل لطافت اوس کی میری اور نہیں کوئی دومرا
اوس کے میرے میانے کہتے عشق مشاطا تسرا

م مراتب عالی درجا وو سوں قرب مقام
لاہوت میانے ٹھانا کر کر واصل رہیں مدام

ن نورانی نور نبی کا کُل شے جس سوں بار
تج میں کیوں ہے نور نبی کا اس کوں دیکھ بچیار

و ولایت جاری چشمہ بولے شاہ ولایت
حواس خمس سوں دل کوں دھونا تو توں پاوے ہدایت

ھ ہدایت آپیں کیتا آپیں تقصیر لیتا
فعل مختاری لینا تجھ پر تو توں حق کوں بھاتا

لام الف مل ایک ہوا ہے کیوں کر کھولا جاوے
قادر جس پہ کرم کرے تو راز رمز وہ پاوے

ی یقین جب کیا معظم تب یو خطاب پایا
جیسا جس کا قال اچھے گا ویسا اُس کا مایا

والسلام حق نے بھیجیا تو بھی بھیج مدام
حق کا پیارا نبی محمدؐ بھیج درود سلام



# معراج نامہ

معراج کا موضوع دکھنی شعرا میں بہت مقبول رہا ہے۔ چناں چہ مثنویوں کے تمہیدی حصوں میں رسولِ اکرم صلعم کی نعت لکھتے ہوئے اکثر شعرا نے معراج کے واقعے پر بھی جی کھول کر خامہ فرسائی کی ہے۔ بعض شعرا نے اس موضوع پر قصیدے بھی لکھے ہیں، جن میں نصرتی کا قصیدہ[1]، جس کو چرخیات میں شامل کیا جاتا ہے، اپنا جواب نہیں رکھتا۔ معراج نامے ان کے علاوہ ہیں۔

قدیم معراج نامے جو دستبردِ زمانہ کے ہاتھوں سے محفوظ رہ سکے ہیں بلاقی[2]، معظم[3]، ہاشمی[4]، سلطان[5]، مختار اور فتاحی[6] کی تصنیف ہیں، اور گیارھویں صدی کے نصف آخر سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں بلاقی کا معراج نامہ غالباً سب سے قدیم ہے، جس کا سنہ تصنیف ۱۰۶۵ ہجری ہے، اور یہ کسی فارسی معراج نامے کا ترجمہ ہے۔

---

[1] مولوی عبدالحق، نصرتی، صفحہ ۲۷۲، اس قصیدے کا ایک نسخہ کتب خانہ گنجی محل میں، اور دو نسخے کتب خانہ انجمن ترقی اردو، پاکستان میں ہیں۔ ایک اور نسخے کا ذکر مولفِ گلِ رعنا نے کیا ہے۔

[2] ملاحظہ ہو، مولوی عبدالحق کا مضمون، مندرجہ سالنامہ کارواں، بابت سنہ ۱۹۳۳ء

[3] فہرست مخطوطات، انجمن ترقی اردو، پاکستان، جلد اول، صفحہ ۴۴۴

[4] فہرست مخطوطات، انجمن ترقی اردو، ہند، اردو ادب، جولائی، ستمبر، سنہ ۱۹۵۴ء، صفحہ ۱۸۲

[5] ملاحظہ ہو، مولوی سخاوت مرزا کا مضمون مندرجہ نوائے ادب، بمبئی، اکتوبر سنہ ۱۹۵۶ء

[6] کتب خانہ نواب سالار جنگ کی اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست، صفحہ ۵۳۷

قصہ یہ ہوا سب خلق میں عجب ؛ کیا چاند شش میں سو ماہِ رجب

ہزار ایک پنج شصت تھیں سال میں ؛ سو اتوار کے روز خوش حال میں

کہ معراج نامے کی سُن یو خبر ؛ حکایت جو بولا ہوں میں مختصر

کیا فارسی کو سو دکھنی غزل ؛ کہ ہر عام ہور خاص سمجھیں سگل[1]

بلاقی کے ٹھیک پانچ سال بعد شاہ معظم نے اپنا معراج نامہ تصنیف کیا:

یو نامہ جہاں میں ہوا جب ختم ؛ اگیارا صدی میں اٹھے تیس[2] کم

رجب کی ستاویں[3] یو نامہ تمام ؛ نبی پر ہزاروں درود و سلام

یہ معراج نامہ ترجمہ نہیں، طبع زاد ہے۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ شاہ معظم کا معراج نامہ اردو کا پہلا طبع زاد معراج نامہ ہے۔

شاہ معظم کے معراج نامے کا ایک نسخہ کتب خانۂ جامع مسجد بمبئی میں محفوظ ہے جو (۲۸) صفحات اور (۱۹۰) اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ ایک قدیم اور انتہائی کرم خوردہ نسخہ ہے۔ عنوانات سرخ روشنائی سے لکھے ہیں۔ سرنامہ نہیں ہے، البتہ ترقیمہ موجود ہے:

"کاتب الحروف فقیر حقیر یوسف علی ۲۰/ جمادی الثانی سنہ ۱۰۴۰ ہجری"

ترقیمے کا سنہ درست نہیں معلوم ہوتا، اس لیے کہ جس مثنوی کا سنہ تصنیف سنہ ۱۰۷۰ ہجری ہو اُس کا سنہ کتابت سنہ ۱۰۴۰ ہجری کیسے ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے اسی خیال کے پیشِ نظر فہرست نگار مخطوطاتِ جامع مسجد بمبئی نے ترقیمے کے سنہ کو سنہ ۱۱۴۰ ہجری بنا دیا ہے۔

---

[1] نصیر الدین ہاشمی، دکن میں اردو، چھٹی اشاعت، صفحہ ۱۲۹

[2] فہرست نگار مخطوطاتِ جامع مسجد بمبئی نے "تیس" کی بجائے "بست" لکھا ہے۔

[3] ستائیس



کتب خانۂ جامع مسجد بمبئی ہی میں اس معراج نامے کے ایک اور نسخے کے چند ابتدائی اوراق معراج نامۂ بلاقی کے ساتھ محفوظ ہیں۔

قاموس الکتب سے پتا چلتا ہے کہ معظم کے معراج نامے کا ایک نسخہ جو (۱۶) صفحات پر مشتمل ہے، مولوی عبد الحق کے کتب خانے میں محفوظ ہے[1]۔

شاہ معظم کی یہ مثنوی سولہ ابواب پر مشتمل ہے۔ ابتدائی پانچ ابواب، حمد، نعت، مدحِ صحابہ، منقبتِ حضرت علی اور منقبتِ اہلِ بیت پر مشتمل ہیں۔ چھٹے باب سے معراج کے واقعات کا ذکر شروع ہوتا ہے، جو پندرھویں باب پر ختم ہوتا ہے۔ سولھویں باب میں دعا اور مثنوی کی تصنیف کی تاریخ ہے۔ بعض طویل مثنویوں (گلشنِ عشق وغیرہ) کی اتباع میں ہر باب کی سرخی ہم زمین شعر میں لکھی ہے۔ عنوان کے ان اشعار کو یک جا کر لیا جائے تو یہ ایک قصیدہ ہو جاتا ہے، جس میں پوری مثنوی کا خلاصہ آ جاتا ہے۔ یہ منظوم سرخیاں درج ذیل ہیں، جن کے مطالعے سے مثنوی کے مضامین کا پوری طرح اندازہ ہو جائے گا:

اول توحید کہتا ہوں سو اُس قدرت کے قادر کا

کہ مالک ہے دو عالم کا او رازق بحر ہور بر کا

نبی کا نعت کرتا ہوں مبارک ذات کا تعریف

کہ او محبوب رب کا ہور ہے صاحب ہفت کشور کا

کتا ہوں منقبت یاراں جو اصحاباں بڑے ہیں یو

نبی کے دو ہیں خلیفیاں عمر صدیقِ اکبر کا

کتا ہوں مدح یو شہ کا کہ او شاہِ ولایت ہے

لقب درگاہ سوں جس کوں علی کرار حیدر کا

(علا)

---

[1] قاموس الکتب، صفحہ ۷۵۸، غالباً اسی مخطوطے کا ذکر فہرست مخطوطات، انجمن ترقی اردو، پاکستان کے صفحہ ۴۴۴ پر ہے اور سنہ تصنیف سنہ ۱۰۸۰ ہجری بتایا گیا ہے۔

ایتا خاتونِ دوراں کا ثنا ہور صفت کرتا ہوں

جگر گوشہ علی کا ہور جو کوئی پیارا ہے سرور کا

یونسِ معراج کی کہتے مشاطا ہو سنواری سو

عجب سنگار باندیا ہوں سو اس کے زر و زیور کا

ہوا ہے امر اشرف یوں لیجا براق تازی کوں

بولا لیا جبرئیل جا توں دیکھا دیدار دل بر کا

نبی خوش خواب سوتے تھے (دیکھا) اپیں روح الامیں آکر

مبارک کہ شہنشہ کوں اپھو تجھ تخت افسر کا

ثنا براق تازی کا جتا تعریف کرتا ہوں

برق سوں تیز تر دستا ہر یک پر جس کے شہ پر کا

شہنشہ شوق سوں اوٹھ کر ہوا ہے سوار تازی پر (سار)

منگیا ہے دیکھنے جا کر درس دل دار دل بر کا

مبارک وقت پر غازی چڑیا ہے تخت نوکھن کا

ہوا ہے شاد شاداں (دل)، دیکھت دیدار دل بر کا

یو جا گا لامکاں کا ہے نہیں یو راز کہنے کا

نبی کوں حق (دیا) خلعت جہاں یو دلق فقرؑ کا

نبی کو بھوک لگی تھی سو کیا معلوم مالک نے (بھک)

اوتر کا نسا سو آیا ہے برنج ہور شیر شکر کا

حضور سوں سوار رف رف کر کیا جب حق وداع شہ کوں (مختصر)

ملے تب جبرئیل آکر کئے ہیں امر و تر کا (و بو تر)



اوتر جب آیا شہ گھر میں خیال خواب کا کرتے

بلال اُٹھ بانگ دیتے ہیں ہوا ہے وقت فجرؓ کا

الٰہی پاس منگتا ہوں امیں بولو محباں سو

معظم عرض کرتا ہے پریشاں حال ابتر کا

مثنوی کا آغاز حسب ذیل شعر سے ہوتا ہے :

اول توحید کہتا ہوں سو اس قدرت کے قادر کا

کہ مالک ہے دو عالم کا او رازق بحر ہور بر کا

جس کے بعد بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھ کر حمد شروع کی گئی ہے۔ گویا متذکرہ بالا شعر حمد کی سرخی ہے۔ حمد کا آغاز ان اشعار سے کیا ہے۔

الٰہی توں قادر ہے سنسار کا ٭ توں آدھار (ہے) سب بڑا دھار کا

رحیماں تو حاکم ہے صاحب سچا ٭ سو کن فیکوں کہتے سب جگ رچا

کیا سات اسمان یک پل منے ٭ ہوا ذوق جس ساعت (سات) تجھ دل منے

سو چودا طبق توں کیا ذوق سوں ٭ دیا رنگ ہور روپ تداں شوق سوں

حمد کے بعد نعت لکھی ہے :

نبی کا نعت کرتا ہوں مبارک ذات کا تعریف

کہ او محبوب رب کا ہور ہے صاحب ہفت کشور کا

مبارک نول ناوں تیرا نبی ٭ بولاتا ہے پیاروں سوں تجھ کوں ربی

عرش پر تو ہے ناؤں تیرا احد ٭ ولیکن کواتا توں آپیں عبد

سماں کے اوپر تجھ کوں احمد کتے ٭ زمیں پر تجھے سب محمدؐ کتے

سو محمود کہتے ہیں تحت الثرا ٭ ترا وصف دستا وراء الورا

سیادت کیرا تج دیا ہے خطاب ٭ اولوالعزم ہور شاہ عالی جناب

دیا رب چھتر تجھ کوں لولاک کا ؛ عطا تجھ کیا تخت افلاک کا

ترے حق میں قران نازل کیا ؛ تجے رب نے سہاریاں میں فاضل کیا

حمد اور نعت کے بعد علاحدہ علاحدہ سرخیوں کے تحت خلفا، حضرت علی اور اہل بیت کی منقبت کی ہے۔ شجرۃ الاتقیا کی طرح اس مثنوی میں بھی معظم نے حضرت علی کی منقبت دو بار کی ہے۔ پہلے حضرت صدیق، عمر فاروق اور عثمان غنی کے ساتھ اور پھر علاحدہ سرخی کے تحت:

کتا ہوں منقبت یاراں جو اصحاباں بڑے ہیں یو

نبی کے دو ہیں خلیفیاں[۱] عمر صدیق اکبر کا

نبی کے مقرب بڑے یار تھے ؛ ابا بکر صدیق دل دار تھے

اول صدق لیائے اونوں برقرار ؛ تدھاں سوں ہوا دین لئی استوار

نبی کے اتھے یار دوجے عمر ؛ کفر کوں کیے فرق سب سر بسر

قضا ہور عدالت کیے برحساب ؛ سو فاروق جس کا ہے روشن خطاب

نبی کے تیجے یار عثمان تھے ؛ ستون دین کے ابن عفان تھے

صحیفے کیے جمع قرآن کے ؛ مرتب کیے سورے فرقان کے

نبی کے اتھے یار چوتھے علی ؛ خطاب منور ہے جن کا علی

کتے ہیں (جسے) شاہ دلدل سوار ؛ کتے ہیں جسے صاحب ذوالفقار

کتا ہوں مدح یو شہ کا کہ او شاہ ولایت ہے

لقب درگاہ سوں جس کوں علی کرار حیدر کا

(ملا)

۱۔ عنوان میں دو خلفا کا ذکر ہے لیکن متن میں چاروں خلفا کی مدح کی ہے



اپنا خاتون دوراں کا ثنا ہور صفت کرتا ہوں

جگر گوشہ علی کا ہور جو کوئی پیارا ہے سرور کا

صحابہ اور اہل بیت کی مدح و منقبت کے بعد اصل مثنوی شروع ہوتی ہے۔ اس باب میں شاہ معظم نے شب معراج کی ایسی کیفیت بیان کی ہے کہ سماں بندھ جاتا ہے:

عجب رات تھی شاہ کے کاج کی ؛ سو پیارے حبیب کے تھی معراج کی

سو لکھن چھبیلی اتھی جگ اوجال ؛ نہ تھی لیلت القدر (الیلۃ) اُس کی مثال

کہاں لیلت القدر ایسی اتھی ؛ نورانی سو یو رات جیسی اتھی

ملائی و عاشق سوں معشوق کوں ؛ لگائی نوا نیہہ کے شوق سوں

....کا سو سس (وہ) پھول لاسرا و پر ؛ دیسی بھاگ ونتی بڑی بخت ور

سو زہرہ ٹیلا کر مندر لائی تھی ؛ زحل کا (دسی) پدک کر گلے بھائی تھی

سو طرا ثریا لگا کان پر ؛ ... لانے بدل شاہ کوں سر بسر

کیتے چاند کی آرسی ناز تے ؛ ... کر عطارد سو چو سار تے

....سی ناک میں مشتری ؛ لطافت بھری جیوں دیسی شہ پری

موہن مال جو اس سو گل گھال کر ؛ اوپر کہکشاں کا سو پھول مال کر

شفق کی کیتی لعل نیلاک نچھل ؛ اوپر قوس (پچھل) کی دامنی بے بدل

جواہر جتے سب ستارے ہوئے ؛ سو میزان کے گوش پارے ہوئے

زلف کھول پیچاں پڑے مکھ اوپر ؛ مگر چاند پر آرہا ہے ابر

جو بجیاں... پاؤں کیاں پائلاں ؛ جسے دیکھ حوراں ہویاں مائلاں

عرش پر بڑا کاج کچ آج ہے ؛ خدا کے حبیب کا سو معراج ہے

ارض ہور سماں کو سو روشن کیا ؛ سو آفاق کوں صاف گلشن کیا

اسی تے دیا شرف اس رات کوں ؛ سو رونق کیا سب سماں رات کوں

اس سہانی اور نورانی رات کو اللہ تعالیٰ نے جبرئیل سے کہا کہ نبی کی خدمت میں حاضر ہو کر ہمارا سلام پہنچاؤ اور کہو کہ آج تم سے ملنے اور کلام کرنے کو دل بہت بے چین ہے۔ اے جبرئیل! اپنے ساتھ ہزاروں لاکھوں نور کے طبق لے جاؤ اور ہمارے محبوب پر سے نثار کرو۔ جنت کو آراستہ پیراستہ کرو۔ عرش کے محلوں کی زیب و زینت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھو۔ کوئی جگہ اور کوئی مقام آرائش و زیبایش سے محروم نہ رہے۔ حوض کوثر لبالب بھرا رہے۔ رضواں سے کہہ دو کہ حوروں کو نکھ سکھ سے درست کرے۔ جنت کے درخت تازہ پھلوں اور میووں سے لدے رہیں۔ جہنم کے مالک کو حکم پہنچا دو کہ دوزخ کے دروازے بند کر دے۔ اس اہتمام کے بعد براق کو ساز و سامان سے لیس کر کے اپنے ساتھ کئی لاکھ ملائک لے کر ہمارے دوست کی خدمت میں حاضری دو اور ہمارا سلام اور پیام پہنچاؤ:

ہوا امرِ اشرف سو رب الجلیل ؛ نبی پاس بیگی سوں جا جبرئیل
تحیات ہور بول میرا سلام ؛ میں منگتا ہوں تجھ سات کرنے کلام
مرے دل منے آج یو شوق ہے ؛ ترے سات ملنا بڑا ذوق ہے
بولا جبرئیل جا توں اس شاہ کوں ؛ دیکھا آج کی رات اُس ماہ کوں
(بُلا)
ملایک کتک لاکھ لے اپ سنگات ؛ بولالیا حبیب کوں، مراتب سنگات
طبق نور سوں بھر ہزاروں ہزار ؛ لیجا اس دل آرام پر سوں نثار
دلا زیب جنت کوں ساری اول ؛ پچھیں جا نبی کے بولانے بدل
بولا جا کے جنت میں براق کوں ؛ کرا مستعد ساز اعراق سوں
عرش سار کے خاص محلاں سنگار ؛ دلا زیب و زیور سو ہر ٹھار ٹھار
بولایا موں میں آج دلبر کیتیں ؛ لبالب بھرا حوض کوثر کیتیں
سو دل دار آتا ہے مہمان آج ؛ نہیں اس تے پیلا کچھ مجھ کوں آج



سو رضواں جنت کو ہوشیار کر ؛ ہر یک شجر میویاں سوں پربار کر
کہ کر سارے حوراں کوں آراستہ ؛ کھلا پھول ہر جنس نو خواستہ
جہنم کے مالک کوں تجھ اک بولا ؛ سو دروازے دوزخ کے حکم دلا

(بُلا)
جبرئیل نے حکمِ خداوندی کی بہ موجب رسول اکرم صلعم کے خیر مقدم کا پورا اہتمام کیا اور پھر مقرب ملائک کو اپنے ساتھ لے کر بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوئے۔ آدھی رات کا وقت تھا، رسولِ اکرم آرام فرما رہے تھے۔ کچھ دیر بعد جب بیدار ہوئے تو جبرئیل نے اللہ تعالیٰ کا پیام اور سلام پہنچایا، اور:

رکھے سر اوپر تاج لولاک کا ؛ مبارک کہے تخت افلاک کا
دیا تاج ہور تخت تجھ راج کوں ؛ بولایا تجھے رب نے معراج کوں
(بُلایا)
دو راہی تیری جگ منے آج ہے ؛ سو تخت الستر الگ تیرا کاج ہے
سنوارے ترے کاج آفاق کوں ؛ کرم کر دیا بھیج براق کوں
سنوارے ترے واسطے عرش سب ؛ بچھائے ہرے پاچ کا فرش سب
سو صدراں اوپر لعل مرجاں کیاں ؛ دسیں بے نظیر شہ ترے شاں کیاں
رنگا رنگ محلاں چتارے تمام ؛ توں آتا ہے کر سب نگارے تمام
ہوا باغ فردوس کا صاف سب ؛ بچھائے ہر یک ٹھار زرباف سب
چمن در چمن سارے لالہ ہوا ؛ ہر یک جا سجا سرو بالا ہوا
جہاں لگ جو شمشاد ہیں سایہ دار ؛ کریں طائراں اس اوپر مرغ زار
سنوارے نزاکت سوں حوراں کتیں ؛ جتیاں بے بدل سب قصوراں کتیں
او حوراں او تم شہ پریاں سار کیاں ؛ ہیں مشتاق تجھ شہ کے دیدار کیاں
مقرب ملائک سو سب آئے ہیں ؛ او تجھ شہ کی خدمت بجا لیائے ہیں
کرم کر تجھے شہ بولانے بدل ؛ دیا نہ بھیج براق تازی نچھل

اس کے بعد براق کی تعریف کی ہے کہ یہ ایک بانکا چھبیلا تازی ہے، جس کی لگام گیان کی ہے، سر اور سم مرجان کے ہیں، یاقوت کا پیش بند، لعل کی دمچی ہے، اس کے منہ پر تارے جڑے ہیں، اسے معرفت سے آشنا کیا گیا ہے، اس لیے کہ اس پر شاہ کون و مکاں سوار ہونے والے ہیں۔

رسول اکرم صلعم جوں ہی براق پر سوار ہوے وہ مسجد اقصیٰ کی طرف روانہ ہوا اور پلک جھپکنے میں وہاں پہنچ گیا۔ براق کے ساتھ تمام فرشتوں نے بھی پرواز کی اور اس طرح رسول اکرمؐ بڑی شان اور دبدبے کے ساتھ روانہ ہوئے۔ مسجد اقصیٰ سے رسول اکرم صلعم نے آسمانوں میں پرواز کی۔ پہلے آسمان پر چاند نے، دوسرے آسمان پر عطارد نے، تیسرے آسمان پر زہرہ نے، چوتھے آسمان پر آفتاب نے، پانچویں آسمان پر مریخ نے، چھٹے آسمان پر مشتری نے خیر مقدم کیا۔ ساتویں آسمان پر نور کے کئی طبق نثار کیے گئے۔

ترنگ سوار جس وقت غازی ہوا ؛ اوسی وقت پرواز تازی ہوا
سو براق (سار) اِت شوق کے خیال میں ؛ سو اقصیٰ کی مسجد کوں یک خیال میں
ہوا پر چلیا زور پنکھ مار مار ؛ اوڑے سات سارے ملک ایک بار
مجل سو سارے ملک فوج کر ؛ چلے دبدبے سوں سو افلاک پر
چپ و راست مل مل ملائک چلے ؛ ہر یک مرتبے سو لیے در پیلے
او تازی ہوا برق سوں تیز تر ؛ چلے جبرئیل زین کا آکل دھر
سعادت سوں پہلے سما کے اوپر ؛ ہوا سوار جب شہ بلند بخت ور
اول چاند خدمت کوں حاضر ہوا ؛ او سی تے دو عالم پہ ناظر ہوا
گگن دوسرے پر چڑیا شہ گھنبیر ؛ عطارد ہوا خاص شہ کا دبیر
چڑیا شاہ تسرے سماوات پر ؛ سو زہرہ کھڑا آ صف باند کر
سہیلے شہنشہ پہ گانے لگیا ؛ کتک جنس باجے بجانے لگیا



جو چوتھے فلک پر چڑے جیوں شتاب ؛ کمر باند حاضر ہوا آفتاب
..... بادل کیرا ہات لے ؛ چلیا کئی ستاریاں کوں سنگات لے
کیا.... جب پانچویں ....نگار ؛ سو مریخ خدمت بدل اپ سنوار
ارادت میں .... اس شاہ کا ؛ سو نوکر ہوا اِس نول ماہ کا
چھٹے چرخ پر جب چڑیا شہریار ؛ مشرف ہوا مشتری زرنگار
غلاماں میں شہ کے سو کم تر ہوا ؛ بزرگی میں ساریاں پہ برتر ہوا
طبق ساتویں پر چڑیا شہریار ؛ نثارے طبق نور کے کئی ہزار

آسمانوں پر ان گنت ملائک اور حوروں نے رسول اکرم صلعم کا خیر مقدم کیا۔ کوئی قصیدہ خوانی کرتا تھا، کوئی پرچم اڑاتا تھا۔ حوروں کی عجب بہار تھی۔ کوئی گاتی اور کوئی ناچتی تھی اور رسول اکرم صلعم کو رجھاتی تھی۔ غرض اس طرح :

دیکھا عیش عشرت سونا سوت کا ؛ کرے سیر سرگشت ملکوت کا
(دوڑھا) ... کیتے چلے آئے جبروت کوں ؛ سنوارے ترت جا کے لاہوت کوں

یہاں پہنچ کر جبرئیل نے کہا کہ یہ سدرۃ المنتہیٰ ہے اور یہی میرا مقام ہے۔ ایسے میں سامنے سے ایک شیر نمودار ہوا۔ آں حضرت صلعم نے جبرئیل سے پوچھا یہ کیا معاملہ ہے۔ جبرئیل نے عرض کیا: یا رسول اللہ یہ شیر خدا ہے، جو خدا کی نظروں سے کبھی اوجھل نہیں ہوتا۔ وہ آپ کی خدمت میں کچھ مانگنے کے لیے حاضر ہوا ہے۔ آپ اس کو اپنی انگشتری عنایت فرمائیں۔ رسول اکرم صلعم نے اس کی طرف اپنی انگشتری پھینک دی اور شیر نے اس کو اپنے منہ میں رکھ لیا۔

اس مقام سے روانہ ہونے کے بعد، کافی فاصلے پر، عرش سے ایک خوان اترا، جس کے نور سے سارے آسمان روشن ہو گئے۔ اس خوان میں چار کاسے دھرے تھے، جن میں سے ایک میں دودھ، دوسرے میں شہد، تیسرے میں پانی اور چوتھے میں شراب

بھری تھی۔ آں حضرت نے دودھ کا پیالہ لیا اور نوش فرمایا۔ جبرئیل نے مرحبا کہا اور بتایا کہ اگر آپ شہد پیتے تو فراموشی پیدا ہوتی، پانی پیتے تو امت غرق ہوتی اور اگر شراب پیتے تو امّت کو بڑا ضرر پہنچتا۔ آپ نے خوب کیا کہ دودھ نوش فرمایا۔ آپ کی امت برقرار رہے گی۔

اس کے بعد رف رف اترا۔ رسولِ اکرمؐ اس پر سوار ہو گئے لیکن جبرئیل تسلیم بجالا کر وہیں کھڑے رہے۔ آں حضرت نے پوچھا: یا اخی! تم کھڑے کیوں ہو۔ کیا ہم اکیلے ہی روانہ ہوں۔ جبرئیل نے عرض کی: اللہ تعالیٰ آپ کا رفیق ہے۔ یہاں سے ایک قدم آگے بڑھوں، میری کیا مجال، میرے پَر جل جائیں گے۔ آں حضرت رف رف پر روانہ ہوئے اور عرشِ معلیٰ پر اترے۔ بصد ادب سجدے کیے اور فرشِ عرش کو بوسہ دیا۔ عرش سے تحیت کی آواز بلند ہوئی۔ ستر ہزار پردے، جو درمیان میں حائل تھے، اُٹھ گئے۔ طرفین کا شوق بڑھا تو صرف قاب قوسین کا تفاوت رہ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے رسولِ اکرم صلعم سے پوچھا کہ میرے لیے کیا نذر لائے ہو۔ رسولِ اکرم صلعم نے عرض کی کہ میں تیرا ایک عاجز بندہ ہوں۔ سوائے عجز کے تیری بارگاہ میں اور کیا پیش کر سکتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ یہ نذر سوائے تمھارے کوئی اور ہماری بارگاہ میں نہیں لایا اور اپنی خوشنودی کا اظہار کیا:

گیا دیکھ رف رف عرش کے اوپر ٭ سو اُترے نبی عرش کے فرش پر
نبی نے ادب سات سجدے کیے ٭ عَرش کے فَرش کوں سو بوسہ دیے
عرش پر گئے جب حبیبِ خدا ٭ تحیات کا حق سوں آیا ندا
اتھے بیچ پردے سو ستّر ہزار ٭ کرم کر کیا دور سب ایک بار
ہوا شوق غالب سو طرفین کا ٭ تفاوت رہیا قاب قوسین کا
کہا رب نبی سوں میرا یار ہے ٭ توں دل بر مرا ہور دل دار ہے
اگر میں نہ پیدا جو کرتا تجھے ٭ تو ہرگز نہ لاتا پتا جہت منجے



مرے سات ملنے جو آیا ہے توں ٭ سو تحفہ نذر کیا جو لیایا ہے توں
نبی نے سو سر جُھیں دھرے ہور کہے ٭ بجز عاجزی مجھ سکت کیا رہے
جو لیاؤں ترے سامنے ذوالجلال ٭ میں مخلوق عاجز مجھے کیا مجال
کیا رب نبی توں جو لیایا نذر ٭ نہیں کوئی لیایا بہ جز تجھ بغیر
دیکھیا جب سیتے خوب خصلت ترا ٭ اوسی تے کیا تجھ کوں نائب مرا
کیا سارے افعال تیرے قبول ٭ اوسی تے کیا تجھ کوں میرا رسول

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب سے خواہش کی کہ جو کچھ اس کے دل میں آرزو ہے کہے۔ رسولِ کریم صلعم نے کہا: اے معبود! میری امت پر کرم فرما۔ میری امت بہت عاجز و ناتواں ہے اور تو ستار و غفار ہے، تو قادر اور حکمت والا ہے، میں نے اپنی امت سے عہد کیا ہے کہ اس کی شفاعت کروں گا۔

تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے میرے حبیب آ تجھے میں اپنے راز و نیاز سے واقف کراؤں۔ جب کچھ نہ تھا اور میں اکیلا تھا تو تیرے دیکھنے کی آرزو پیدا ہوئی۔ تجھے میں نے اپنے نُور سے اور اس ساری کائنات کو تیرے نُور سے پیدا کیا۔ اسی وقت سے میں تیرا شیدائی ہوں، گنجِ مخفی کی کنجی تیرے حوالے کی، تجھ پر ہر راز منکشف کیا اور اسمِ اعظم کا شغل عنایت کیا:

احد تیں جو اول بدھاں کچھ نہ تھا ٭ تدھاں ہو یکیلا چہ میں ایک تھا
تجے دیکھنے مج کوں آیا ہوس ٭ ... کر تجھے میں جو دیکھا اپس
تدھاں سونچہ ہے پیار تجھ پر ادیک ٭ رہتا ہوں ترے شاہ رگ سوں نزیک
مرے نور سوں تج کوں پیدا کیا ٭ ترے نور سوں سب ہویدا کیا
تدھاں سو ترے من میں بستا ہوں میں ٭ تدھاں سوں ترے دل میں اچھتا ہوں میں
توں مغرب کوں جایا توں مشرق کیرا ٭ ترے موں کے ہے سامنے موں میرا

دیا پانچ گنج کا کیلی میں تجھے ✤ لگیا توں بہت آج پیارا مجھے
جو کچھ کشف تجھ پر ہدایت کیا ✤ شغل میں تجھے اسم اعظم دیا

ایسے میں رسولِ اکرم صلعم کو ایک محل نظر آیا اور آپ نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا کہ یہ کیا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہاں میرا گنج مخفی ہے۔ تیری انگشت مبارک سے اس کا قفل کھل جائے گا:

توں جا دیکھ اس میں ہے قدرت مرا ✤ یو قدرت مرا ہے سو قدرت ترا

معظم کہتے ہیں کہ یہ لامکاں ہے اور اس کا راز کہنے میں نہیں آتا۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں نبی کریم صلعم کو خلعتِ فقر عطا کیا۔

رسول اکرم جب اس محل میں داخل ہوئے تو وہاں سوائے نور کے کچھ نہ تھا اور سوائے ایک کلمہ کے وہاں کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ رسولِ کریم نے اللہ تعالیٰ سے کہا: یہ کیا بھید ہے، کھول کر ارشاد فرما۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

دیا رب وجود نہیں جو دستا ہے یو ✤ ترا نور مجھ میں ہوا ہے محو
ترا نور آ کر ملیا نور میں ✤ ندی جیوں ملے جا کے سمدور میں
کلیم مجید.... سو خرقہ میرا ✤ بڑے پیار کا ہے یو برقہ مرا
جو تشریف تجھے دیوں گا خوب ہے ✤ بجز توں مجھے کون محبوب ہے
ولیکن کتا ہوں تجھے یا رسول ✤ ادب بھوت رکھ ہور خاقہ قبول

رحیماں رحم ہور کرم بی کیا ✤ یو خرقہ فقر کا نبی کوں دیا

شاہ معظم کہتے ہیں کہ اس کے بعد رسولِ اکرم کو اشتہا محسوس ہوئی۔ غیب سے شیر برنج کا ایک کاسہ اترا۔ رسول اکرم کو اکیلے شیر برنج کھانے میں تکلف محسوس ہوا اور انھوں نے اللہ تعالیٰ سے اپنے اس تردہ کا اظہار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے کہا: اچھا



تم ہمارا نام لے کر شروع کرو، کوئی شریک ہو جائے گا۔ رسول اکرم نے شیر برنج سیر ہو کر کھایا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے بڑے پیار سے ایک خربوزہ عنایت فرمایا، جو مصری سے زیادہ میٹھا تھا۔ رسولِ اکرم نے خربوزہ تو کھا لیا لیکن بیج امت کے لیے چھپا رکھے۔ اللہ تعالیٰ نے بڑے لطف سے پوچھا کہ اے میرے حبیب تم نے چوری کیوں کی۔ رسولِ اکرم نے جواب دیا تو مومن اور مہیمن ہے، میں تجھ سے کیا عرض کر سکتا ہوں۔ یہ بیج میں نے امت کے لیے بچا لیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو بڑی خوشی ہوئی کہ اس کے حبیب کو اپنی امت کا اتنا خیال ہے۔

معظم کہتے ہیں کہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مجھے تمھارے دیکھنے کا شوق ہوا تھا، اس لیے تم کو بلایا۔ تمھارے دیکھنے سے دل کو تسکین ہوئی، اب تم سدھارو۔ اس موقعے پر شاعر رسول اکرم کو مبارک باد دیتا ہے:

مبارک ہسم کی (دیو) معراج ہے ✤ مبارک ترا تخت ہور راج ہے
اچھو ہفت کشور میں شاہی تری ✤ سو تحت الثریٰ لگ دوراہی تری
مبارک تجھے تاج لولاک کا ✤ مبارک تجھے تاج افلاک کا

رسولِ اکرم رف رف پر سوار ہو کر عرش سے روانہ ہوئے۔ بہت دور جانے کے بعد جبرئیل سے ملاقات ہوئی۔ جبرئیل نے رسولِ اکرم سے کہا کہ دوگانۂ شکرانہ ادا کیجیے اور امت پر اس کو واجب کیجیے۔ اس کے بعد جنت کی سیر کرائی۔ یہاں جتنے ملائک، اولوالعزم اور مرسل تھے، ان سے آں حضرت کی ملاقات ہوئی۔

معراج کے واقعے کو ختم کرتے ہوئے معظم نے دو مشہور روایتوں کو نظم کیا ہے۔ ایک تو یہ کہ اس سیر کے بعد جب رسول اکرم گھر لوٹے تو بستر گرم تھا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ ایک یہودی کو آں حضرت کی یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوئی کہ بستر کی گرمی کم ہونے بھی نہیں پائی تھی کہ وہ آسمانوں کی سیر کر کے لوٹ آئے، لیکن خود وہ ایک ایسے تجربے

سے گزرا کہ جس کے بعد رسولِ اکرم کی بات پر ایمان لانا پڑا۔

آخری باب میں معظم نے مناجات کی ہے:

. . . . سب کو معمور کر ؛ ایتا جگ میں نامہ یو مشہور کر

مرا عرض ہے تجھ سوں اے کردگار ؛ ہمیں ہو اچھے جگ میں یو یادگار

پڑھے یا سنے کوئی اسے کان دھر ؛ نبیؐ کے بدل توں او سے پیار کر

توں ستار، غفار اے کارساز ؛ گنہ بخش میرا اے بندہ نواز

یو نامہ کیا کر مجھے حق دیا ؛ مجھ عاجز کو سلطان معظم کیا

یو نامہ جہاں میں ہوا جب ختم ؛ اگیارہ صدی میں اتھے تیس کم

رجب کی ستاویں یو نامہ تمام ؛ نبی پر ہزاروں درود و سلام

شاہ معظم نے اپنی اس مثنوی میں ان تمام ضعیف اور من گھڑت روایات کو بغیر کسی تحقیق کے پوری عقیدت اور کامل یقین کے ساتھ نظم کر دیا ہے، جو معراج کے تعلق سے عام ہیں۔ یوں بھی وہ تاریخ، بزرگوں کے سوانح اور کرامات کے تعلق سے ہر سنی سنائی بات کو، خواہ وہ روایت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، پورے وثوق کے ساتھ بیان کرنے کے عادی ہیں۔ چنانچہ شجرۃ الاتقیا اور گلزارِ چشت میں اس قسم کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔

زیرِ نظر مثنوی کے اس حصے پر جہاں شب معراج کا ذکر ہے، شاہ معظم نے بڑا زورِ قلم صرف کیا ہے۔ ادبی حیثیت سے یہی حصہ مثنوی کی جان ہے۔ دو ایک جگہ اور بھی ادبی جھلکیاں ملتی ہیں، مثلاً براق کے سراپا کا بیان ندرتِ فکر اور شاعرانہ تخیل کا بہترین نمونہ ہے۔ ان مقامات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ معظم چاہتے تو پوری مثنوی میں شاعرانہ لطافت پیدا کر سکتے تھے، لیکن انھوں نے فکر و فن پر نہیں بلکہ روایتوں کی



گھناونی پر زیادہ توجہ دی ہے اور روایتیں بھی ایسی ہیں جن کو عقل تسلیم نہیں کرتی۔ اس لیے یہ مثنوی نہ تو فلسفۂ معراج کی توجیہ و تشریح کے اعتبار سے کوئی اہمیت رکھتی ہے اور نہ ادبی محاسن کے لحاظ سے دکھنی ادب میں اس کو کوئی مقام نصیب ہو سکتا ہے۔ تاہم معراج کے بیان میں قدیم ترین اچھی نظم ہونے کی وجہ سے اس کی اہمیت مسلم ہے۔

# ساقی نامہ

شاہ معظم کی اس مثنوی کا صرف ایک ہی نسخہ دست یاب ہوتا ہے، جو کتب خانۂ انجمن ترقی اردو، ہند، دہلی (نمبر مخطوطہ ۷۲، تصوف) میں محفوظ ہے۔ یہ نسخہ (۱۵) صفحات اور (۱۹۱) ابیات پر مشتمل ہے۔ سرِ نامہ اور ترقیمہ نہیں ہے ساقی نامہ شاہ معظم کا ادبی کارنامہ ہے، لیکن کتابت کی غلطیوں کی وجہ سے اس کے اکثر الفاظ مسخ اور متعدد مصرعے بحر سے ساقط ہوگئے ہیں۔ جب تک اس مثنوی کا کوئی دوسرا نسخہ برآمد نہ ہو صحیح متن کا مرتب کرنا بہت مشکل ہے۔

مثنوی کی لوح پر دو نام جدید قلم سے لکھے ہوئے ہیں۔ ساقی نامہ یا راگ مالا۔ اگرچہ ساقی نامے میں ساقی اور مطرب سے خطاب اور مے و سرود کی تعریف ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود کسی مثنوی کا نام ساقی نامہ یا راگ مالا ان مل اور بے جوڑ سا معلوم ہوتا ہے اور شاہ معظم جیسے باکمال اور صاحبِ ذوق شاعر سے اس بد ذوقی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ یہ ستم ظریفی انجمن کے فہرست نگار کے قلم کی ہے۔

زیرِ نظر مثنوی کے نصف اول میں ساقی نامے کے مضامین باندھے گئے ہیں اور نصف آخر میں نغمہ و سرود کی عظمت اور اس کے اثرات کا شاعرانہ انداز میں ذکر ہے۔ نصف اول کی طرح نصف آخر کے مضامین بھی ساقی نامے ہی کے ہیں۔ اس لیے



نغمہ و سرود کے ذکر کے باوجود اس مثنوی کو ساقی نامہ ہی کہنا چاہیے۔

راگ مالا اصطلاح میں اس نظم کو کہتے ہیں، جس میں سنگیت کی اصل، اسمیں کی پیدائش، راگوں، راگنیوں، پتر اور بھارجاؤں کی تفصیل، ان کے موکلوں، رنگ، پوشاک، تاثیر اور ان کے موسم اور وقت کا بیان ہوتا ہے۔ سنسکرت، ہندی اور ہندستان کی دوسری زبانوں میں اس قسم کی بیسیوں نظمیں[1] ملتی ہیں، لیکن اردو میں صرف ایک ہی راگ مالا کا پتا چلا ہے[2]، جو بارھویں صدی کے رند مشرب، صوفی منش، اور سیلانی الطبع شاعر عبدالولی عزلت (۱۱۰۴ - ۱۱۹۸ ہجری) کی تصنیف اور ان کے کمالِ موسیقی کی سند ہے۔ یہ مثنوی (۱۱۹۵) ابیات پر مشتمل ہے، جس میں چھ راگوں، ان کی پانچ راگنیوں اور آٹھ پتروں کی تفصیل اور ان کی لفظی تصویریں پیش کی گئی ہیں۔ معظم کی مثنوی میں راگ مالا کے یہ مضامین اور موضوعات نہیں ملتے۔ اس لیے وہ اصطلاحی مفہوم میں راگ مالا نہیں ہے۔ البتہ راگ مالا کے اصطلاحی مفہوم میں اتنی وسعت اور لچک پیدا کی جائے کہ ساز و سرود کی عمومی توصیف اور ان کے کیف و سرور کے بیان کے لیے بھی اس میں جگہ نکل آئے تو پھر شاہ معظم کی یہ مثنوی ساقی نامہ بھی ہے اور راگ مالا بھی، لیکن جب ساقی نامے کے موضوعات میں مے و ساقی کے ساتھ مطرب و نغمہ کے لیے بھی گنجائش موجود ہے تو راگ مالا کے دامن کو اتنا وسیع کرنا کیا ضروری ہے کہ اس کے تار و پود ہی بکھر جائیں۔

شاہ معظم کی یہ مثنوی کئی اعتبارات سے بڑی اہم ہے۔

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راگ راگنیاں از او۔ سی۔ گنگولی۔

[2] ایک نسخہ کتب خانۂ آصفیہ (مثنویات ۹۱) اور دوسرا انڈیا آفس (۱۰۱) میں ہے۔ مشفق خواجہ کے بیان کے مطابق انجمن ترقی اردو، پاکستان کے کتب خانے میں کسی مخطوطے کی ایک نقل محفوظ ہے، جو زمانۂ حال کا لکھا ہوا ہے (بہ حوالۂ راگ مالا مرتبہ عبدالرزاق قریشی، صفحہ ۱۶) قریشی صاحب نے انھیں مخطوطات کی بنیاد پر راگ مالا مرتب کر کے شائع کی ہے۔

پہلی اور سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ اردو کا پہلا ساقی نامہ ہے۔ ساقی نامہ فارسی کی دین ہے، جو عموماً بحر متقارب مثمن مقصور (محذوف) اور مثنوی کی ہیئت میں لکھا جاتا ہے۔ مے و مینا، ساقی و شاہد، نغمہ و مطرب اور کیف و مستی کے مضامین ساقی نامے کے بنیادی موضوعات ہیں، لیکن کبھی کبھی ان مضامین کے علاوہ دنیا کی بے ثباتی، کمال کی ناقدری اور گردشِ روزگار کا ذکر بھی کیا جاتا ہے اور تصوف و حکمت کے نکات بھی بیان کیے جاتے ہیں۔ دکنی ادبیات میں یہ مضامین ابتدا ہی سے ملتے ہیں، لیکن اس مرتب اور مربوط شکل میں نہیں ملتے، جس سے ساقی نامہ عبارت ہے۔ شیخ چاند مرحوم نے محمد نقیبہ درد مند کے ساقی نامے[1] کے مقدمے میں لکھا ہے:

"درد مند کو اردو زبان کی تاریخ میں جو جگہ ملتی ہے وہ محض اُن کی مثنوی ساقی نامے کی وجہ سے۔ یہ ایک مثنوی ہے، جس کا تعلق خمریات سے ہے۔ یہ کوئی عشقیہ مثنوی نہیں ہے، اس لیے اس میں کسی فسانے کی مسلسل و مربوط روداد نہیں۔ اس کے نام (ساقی نامے) سے ظاہر ہے کہ رندی و مستی اور خمر و نشہ کے مضامین کی حامل ہے۔ اس کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ اردو زبان میں اِن مضامین کو اس شکل میں مستقل طور سے پہلی دفعہ اس قادر الکلامی کے ساتھ قلم بند کیا گیا ہے۔"[2]

اس خیال کو زیادہ وضاحت کے ساتھ آگے یوں لکھا ہے:

---

[1] شیخ چاند مرحوم نے مولوی عبدالحق کے کتب خانے کے تین نسخوں سے مقابلہ کر کے ساقی نامہ درد مند کا متن طویل تحقیقی مقدمے کے ساتھ رسالہ اردو بابت جولائی ۱۹۳۴ء عیسوی میں شائع کیا تھا۔ ساقی نامہ درد مند کا ایک نسخہ کتب خانۂ آصفیہ، حیدر آباد، میں اور ایک کتب خانۂ انجمن ترقی اردو، ہند، علی گڑھ، دہلی، میں بھی محفوظ ہے۔

[2] رسالۂ اردو، بابت جولائی ۱۹۳۴ء عیسوی، صفحہ ۵۸۲



"فارسی میں ساقی نامے شاعروں نے کثرت سے لکھے ہیں، لیکن اردو میں اُن کا وجود نہ تھا۔ درد مند سب سے پہلا شاعر ہے، جس نے اس اہتمام اور کامیابی کے ساتھ یہ نظم لکھی کہ اس کے بعد کسی شاعر کو لکھنے کی ہمت نہیں ہوئی اور یہی وجہ ہے کہ تمام اساتذہ نے اس کی تعریف متفق اللسان ہو کر کی ہے۔"[1]

شیخ چاند مرحوم کے اس ادعا کو پچھلے تیس برسوں میں برابر دہرایا جاتا رہا ہے، چنانچہ ساقی نامۂ عزلت[2] کے مقدمے میں بھی اس کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے:

"سلطان محمد قلی قطب شاہ اور قدیم شعرا کے یہاں تعریفِ شراب سے متعلق جو چند اشعار پائے جاتے ہیں وہ قدیم عربی و فارسی شعرا کی مدحِ خمر کی طرح محض زیبِ داستاں کے لیے ہیں۔ سب سے پہلے جس شاعر نے اس صنف کی طرف توجہ کی وہ محمد فقیہہ درد مند ہیں۔"[3]

لیکن واقعہ اس کے خلاف ہے۔ سب سے پہلا شاعر جس نے اس صنف کی طرف توجہ دی وہ درد مند نہیں معظم ہے۔ درد مند کے ساقی نامے کے سنہ تصنیف کا علم نہیں، عزلت نے درد مند کے جواب میں اپنا ساقی نامہ سنہ ۱۱۷۴ ہجری میں لکھا تھا۔ "بیانِ ظہور" اس کا تاریخی نام ہے۔ درد مند اور عزلت ہم عصر تھے۔ اس لیے قیاس کہتا ہے کہ درد مند کا ساقی نامہ ۱۱۷۴ھ ہجری سے کچھ ہی پہلے لکھا گیا ہوگا۔ شاہ معظم کے ساقی نامے کے سنہ تصنیف کا پتا نہ چل سکا، لیکن اس کو اگر ان کی آخری عمر کی تخلیق بھی مانا جائے

---

[1] رسالۂ اردو، بابت، جولائی سنہ ۱۹۳۴ عیسوی، صفحہ ۵۸۳

[2] عبدالرزاق قریشی نے ساقی نامۂ عزلت کے ایک ناقص متن کو نوائے ادب جولائی سنہ ۱۹۶۴ عیسوی میں شائع کیا ہے۔

[3] ساقی نامۂ عزلت، نوائے ادب، بابت جولائی سنہ ۱۹۶۴ عیسوی، صفحہ ۶

تو اس کا زمانۂ تصنیف بارھویں صدی کی تیسری دہائی ہوگا۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ معظم کا ساقی نامہ دردمند کے ساقی نامے سے کم از کم پچاس سال پہلے لکھا جاچکا تھا۔

اگرچہ کوئی داخلی یا خارجی شہادت ایسی دست یاب نہیں ہوتی، جس کی بنیاد پر یہ کہا جاسکے کہ دردمند کی نظر سے شاہ معظم کا ساقی نامہ گزر چکا تھا، لیکن راقم الحروف کا قیاس ہے کہ وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ ساقی نامۂ معظم سے واقف ہوں گے۔ اس لیے کہ وہ خود دکھن کے باشندے تھے[۱] اور دوسرے یہ کہ ان کے پیر اور استاد مرزا مظہر جانِ جاناں کے والد مرزا جان سنہ ۱۱۱۱ ہجری سے قبل عالمگیری فوج کے ساتھ بیجاپور میں رہ چکے تھے اور یہیں شادی بھی کرلی تھی۔[۲] یہ تو نہیں معلوم کہ مظہر جانِ جاناں کی بیجاپور کو آمد و رفت رہی یا نہیں لیکن قرینہ اس کا ہے کہ ننھیال سے تعلق برقرار رہا ہوگا۔ جبھی تو اُن کا کلام ان کی زندگی ہی میں بیجاپور پہنچا اور مقبول ہوا۔ یہی نہیں بلکہ بیجاپوری شعرا نے اِن کی غزلوں پر غزلیں کہیں۔ چناں چہ قطع نظر دوسرے شعرا کے حضرت امین کے سلسلے کے چوتھے سجادے باباشاہ حسینی عرف پیر پاشاہ کی بعض غزلیں ایسی ملتی ہیں جو جانِ جاناں کی غزلوں پر کہی گئی ہیں۔[۳] ان واقعات کی بنا پر یہ قیاس دور از کار نہیں کہ مظہر جانِ جاناں بیجاپوری شعرا کے کلام سے واقف ہوں گے اور معظم کا ساقی نامہ اُن کی

---

۱ اودگیر ضلع بیدر (سابق حیدرآباد، حال کرناٹک) کے نجبا سے تھے۔ کم سنی میں اپنے والد کے ساتھ سنہ ۱۱۳۶ ہجری میں شاہ جہاں آباد دہلی چلے گئے۔ ابتدا میں شاہ ولی اللہ اشتیاق سرہندی کے زیر تربیت رہے، پھر والد کے انتقال کے بعد جانِ جاناں کے سایۂ عاطفت میں آگئے۔ فارسی کے شاعر تھے۔ ریختے کی نسبت لکھا ہے کہ جانِ جاناں کی محبت سے مجبور ہوکر اس میں طبع آزمائی کی۔ دلی میں ان کا قیام تیس سال رہا۔ مرشد آباد میں انتقال ہوا۔

۲ آبِ حیات (مکتبۂ اشاعتِ اردو) صفحہ ۱۶۸

۳ سخاوت مرزا، دیوانِ سید شاہ حسینی بیجاپوری، اردو ادب، بابت جولائی سنہ ۱۹۶۰ عیسوی، صفحہ ۴۶



نظر سے گزرا ہوگا، اور ان کے توسط سے ان کے محبوب شاگرد اور مرید کو اس ساقی نامے کی سُن گُن ملی ہوگی بلکہ کیا عجب ہے کہ جانِ جاناں نے دردمند کو معظم کے ساقی نامے کے ڈھنگ پر ایک ساقی نامہ لکھنے کا مشورہ بھی دیا ہو۔ اس قیاس کو تقویت خود دردمند کے ان اشعار سے ہوتی ہے:

خدیوِ سخن میرزا جانِ جاں ٭ کہ حکم اس کا ہے ناطقے پر رواں

اوسے سب میں یارب امامت رہے ٭ قیامت تلک وہ سلامت رہے

کہاں تھا مجھے ریختے کا خیال ٭ ہوا واجب اس امر کا امتثال

محبت نے مجھ کو کیا لاجواب ٭ وگرنہ میں اور ریختہ کیا حساب

دردمند، معظم کے ساقی نامے سے بے خبر بھی رہے ہوں تو بھی تقدمِ زمانی معظم ہی کو حاصل ہے۔

ساقی نامے کے بنیادی موضوع مے و نغمہ کو معظم نے دو حصوں میں بانٹ دیا ہے پہلے حصے میں مے و مینا اور کیف و مستی کے مضامین باندھے ہیں اور دوسرے حصے میں ساز و نغمہ اور اس کے سرور و نشاط کو بیان کیا ہے۔ معظم نے ساقی نامے کے ان دو موضوعات پر بہ ظاہر دو علاحدہ حصوں میں طبع آزمائی کی ہے، لیکن درحقیقت اس ساقی نامے کا بنیادی موضوع کیف و مستی ہے، جو ایک حصے میں شراب سے حاصل کی گئی ہے اور دوسرے حصے میں نغمے سے۔ تاہم ساقی نامے میں مے و نغمے کے موضوع کا یہ تجربہ معظم کی جدتِ طبع کا نتیجہ ہے۔ معظم کے بعد مستقل صنفِ ادب کی حیثیت سے کم ہی ساقی نامے لکھے گئے ہیں، لیکن اُن میں بھی کہیں یہ جدت اور اپج نظر نہیں آتی۔ دردمند نے اپنے ساقی نامے کے آخری حصے میں مطرب کا ذکر ضرور کیا ہے لیکن انتہائی سرسری انداز میں اور دو چار اشعار پر ہی اکتفا کیا ہے۔

ساقی نامۂ معظم کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اس مثنوی کو حقیقت اور مجاز

کے تارِ حریرِ دو رنگ سے اس خوب صورتی اور چابک دستی کے ساتھ گوندھا گیا ہے کہ کوئی رنگ دوسرے پر غالب نہیں آتا۔

چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ یہ مثنوی شاہ معظم کی صوفیانہ شاعری کے سرمایے میں سب سے زیادہ ادبی نکھار رکھتی ہے۔

معظم مثنوی کا آغاز خدا کی ساقی گری کے ذکر سے کرتے ہیں:

الٰہی توں ساقی ازل سوں مدام ؎ پلاتا ہے توں جام سب کو تمام
پلاتا ہے اول بھی آخر سو توں ؎ شراباً طہوراً بی محشر سو توں
سقا ہوں کھیا ہے او آپیں دھنی ؎ ہے ساقی ہمارا او آپیں غنی

خدا کی ساقی گری کے ذکر کے بعد دو شعروں میں ساقی کی حیثیت سے رسولِ اکرمؐ کا ذکر کیا ہے:

اتا توں پلانے کوں نائب کیا ؎ کتے ہیں جسے خاتم الانبیا
حیات النبی ہات لے جام کوں ؎ پیلاتا ہے سب خاص ہور عام کوں
(پلاتا)

خدا اور رسول کے ذکر کے بعد وہ کائنات کی ہر شے کو اسی شراب کے نشے سے سرشار دکھاتے ہیں اور اپنے پُرجوش اسلوب میں ایک ایک چیز کی مستی اور سرشاری کا ذکر کرتے جاتے ہیں:

اسے پی سوں ہیں مست سب انبیا ؎ اسے پی سوں ہیں مست سب اولیا
اسے پی سوں یو مست عشاق ہیں ؎ اسے پی کے عاشق یو مشتاق ہیں
اسے پی سوں یو مست مجذوب ہیں ؎ اسے پی سوں یو مست محبوب ہیں
اسے پی سوں مدہوش شہدا ہوئے ؎ اسے پی سوں سرمست شیدا ہوئے
اسے پی سوں مقبول، واصل ہوئے ؎ اسے پی سوں کامل یو فاضل ہوئے



اسے پی سوں ہو مست شمس و قمر ؎ دیکھو مست پھرتے ہیں کیوں بے خبر
زمانہ ہوا مست ہور ملک بھر ؎ دیکھو چرخ پھرتا ہے گردش قمر
دیکھو مست سارے ستارے ہوئے ؎ فلک پر کے سارے یو تارے ہوئے
دیکھو مست ہو قطب ہلتا نہیں ؎ ہوا کیف سوں کیں او چلتا نہیں

مظاہرِ کائنات کی مستی کا یہ ذکر طولانی ہے، لیکن جس طرح اوپر کے اشعار کے صدر میں ایک جیسے فقروں کی تکرار سے زورِ بیان پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے بقیہ اشعار میں یہ اہتمام ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ بہرحال ساری کائنات کو مست و بے خود بتانے کے بعد وہ اپنے آپ سے مخاطب ہوتے ہیں کہ اے معظم اُٹھ اور ساقی سے جامِ خاص کے لیے التماس کر، اور ساقی کے استعارے کو کھولتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمارا ساقی خدا کا رسول ہے اور رسول کے نائب علی ہیں اور علی ہی ساقیِ کوثر ہیں۔ اسی ساقیِ کوثر سے دین اور دنیا کی کامرانی وابستہ ہے:

ہمارا ہے ساقی خدا کا رسول ؎ مناجات میرا کرے گا قبول
نبی کا سو نائب علی ہیں کتے ؎ او برحق خدا کا ولی ہیں کتے
نبی کا کتے یار یاور ہے او ؎ پیلانے کوں ساقیِ کوثر ہے او
اُسی سوں پچ یو عرض کرتا ہوں میں ؎ اُسی سوں پچ بی کام دھرتا ہوں میں
اُسی سوں پچ محشر میں مجھ کام ہے ؎ اُسی سوں پچ دنیا میں آرام ہے

اس سلسلے کے اشعار کو آگے اتنا اُلجھا دیا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ عرض رسولِ کریمؐ سے ہے یا حضرت علی سے یا اللہ تعالیٰ سے۔ چناں چہ کہتے ہیں:

ازل کا توں استاد میرا حکیم ؎ ہے مشہور تیرا کرم یا کریم

تخاطب جس کسی سے ہو التجا شرابِ معرفت کی ہے، لیکن اس کے بعد بد کیفی اور شراب کی آرزو کا ذکر جس انداز میں کیا ہے اُس سے تو، اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شراب

حقیقی نہیں مجازی ہے:

مرے سر میں ہے درد خمار کا ؞ ہے دوسرا درد مج کوں بیمار کا

اسی درد کا تن میں مج تاب ہے ؞ اسی درد سوں جیو بے تاب ہے

منجم اور فال ہارے تمام ؞ مداوا کیے آکے سارے تمام

درد دیکھ ہارے ہیں سارے حکیم ؞ جیتے شہر میانے ہیں سارے ندیم

نجانوں مرا جیو ہے تن میں کہاں ؞ نجانوں چھوپا ہے بدن میں کہاں
(چھپا)

تداوے کدھیں جو کروں ہوش میں ؞ نپٹ ہوکے پڑتا ہوں بے ہوش میں

شراب کوئی سی ہو التجا بہ ہر صورت ساقیِ حقیقی ہی سے ہے:

ہر یک باب کا علم رکھتا ہے توں ؞ ہر یک باب حکمت ہی دھرتا ہے توں

کتے خوب حکمت ہے تج جان میں ؞ ایتا دور کرتا ہے یک ساعت[1] میں
(سات)

ایتا جام دیتا ہے کوی پیار سوں ؞ ایتا دور کرتا ہے آزار سوں

ایتا دور ہوتا ہے کلفت مرا ؞ ایتا دور ہوتا ہے زحمت مرا

ایتا عرض ہے تج سوں اے کارساز ؞ ایتا جام دو چار کر سرفراز

ساقیِ حقیقی سے اس تخاطب کے بعد پھر وہ شراب کی التجا اس طرح کرتے ہیں جیسے یہ مجازی شراب ہے اور لطف یہ ہے کہ وہ رات کے گزر جانے کے اندیشے کا اظہار بھی کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ طلوعِ آفتاب سے پہلے جس قدر پی سکتے ہوں پی لیں۔

ساقی نامے کے وہ شعر بہت دل چسپ ہیں، جن میں شاہ معظم رات کے آخری پہر، سپیدیِ سحر، باغ و بہار کی کیفیت وغیرہ کا ذکر ایک بادہ خوار کی طرح للچا للچا کر کرتے ہیں:

اے ساقی یو پھرا ہوا نور کا ؞ طلب کر مےِ ناب انگور کا

---

[1] آن ہونا چاہیے



اے ساقی منگا جام جمشید کا ؞ اجالا ہوا دیکھ خورشید کا

توں اوٹھ بیگ ساقی کرم کر عمیم ؞ چلیا ہے یو بادِ صبا خوش نسیم

کرم کر اے ساقی عجب وقت ہے ؞ مجھے درد خمار کا سخت ہے

پینا مےَ زمستان کے ہنگام میں ؞ یو پھر جوان ہوتا ہے یک جام میں

اس سلسلے میں شاہ معظم نے بڑی شاعرانہ معنی آفرینی کی ہے۔ وہ کہتے ہیں، کہ اے ساقی تو اپنے آفتاب جیسے چہرے سے نقاب الٹ دے، ورنہ آفتاب نکل آئے گا۔ اور شراب کا سارا لطف جاتا رہے گا۔

اے ساقی تو مکھ پر سے سٹ دے نقاب ؞ مبادا نکل آئے گا آفتاب

پیلا بیگ ہر قدح مج نور کا ؞ ہے مشرق طرف دبدبا سور کا
(پلا)

یو خرقہ گرو رکھ کے یک جام دے ؞ پیا پے پیلا مج کون آرام دے

اے ساقی تو واقف مرے حال کا ؞ منگا جام کہنہ اودہ سال کا

دسے تب مجھے گنج لاریب کا ؞ دفینہ نکل آئے سب غیب کا

اے ساقی یو فرصت سمجھ کر چکا ؞ منگا او صراحی ہرے پاچ کا

پیے سوں کتے دور ہوتا ہے رنج ؞ زمیں سے کتے اس کوں دکتا ہے گنج

اے ساقی مےِ ناب صاف و صفا ؞ شکستہ دلاں کوں کیے ہے نفا

منگیا بیگ ساقی رنگیلا شراب ؞ پیاسے کوں پانی پیلانا صواب
(ثواب)

ظاہر ہے کہ ان اشعار میں رات کی فضا، طلوعِ آفتاب کا اندیشہ، مےِ انگور کی آرزو، نشہ کی مختلف کیفیات کا بیان مجازی مےَ و مستی سے تعلق رکھتا ہے، لیکن عجیب بات ہے کہ اس کے بعد ہی وہ اپنے شیخ قادر لنگا سے مخاطب ہو جاتے ہیں:

اے قادر تو ساقی سزاوار ہے ؞ پیلانے کوں توں دور... ہے

ترا عکس دیکھا جو کوئی جام میں ؞ رہتا ہے متا ہو کر آرام میں

ان اشعار کے بعد کسی تمہید کے بغیر کسی مخصوص پُرفضا مقام کی کیفیت کا بیان ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس جگہ کچھ شعر چھوٹ گئے ہیں:

یو جاگا اسی سے فرح بخش ہے ؛ کتے ہفت کشور اُپر نقش ہے
یو شرف المکاں، ہیچ بیت الحرم ؛ تصدق کیا اس پہ باغ ارم
عجائب درختاں کوں دیکھ سایہ دار ؛ کتے عاشقاں اس کوں دار القرار
حریفاں اُسے باغ بستاں کتے ؛ پھلوں کو یہاں کے گلستاں کتے
عجب باغ روشن منور ہے یو ؛ عجب حوض میانے تو کوثر ہے یو
دنیا میں تو یو باغ فردوس ہے ؛ کتے نیں جو دیکھا تو افسوس ہے
ہمیشہ یہاں یار کا ہے گزر ؛ ہوا باغ یو مست سب سیر کر
دیکھو مست ہو سرو ڈھلتے ہیں کیوں ؛ دیکھو مست شمشاد ڈھلتے ہیں کیوں
دیکھو مست دستے ہیں سر بن کے پھول ؛ ہوے مست سارے یو گلشن کے پھول
زُلف دیکھ کر مست سنبل ہوا ؛ اسے دیکھ کر مست بلبل ہوا
امی یار کا دیکھ کہنے کوں راز ؛ یو سوسن زباں کوں کیا ہے دراز
نین دیکھ کر مست نرگس ہوا ؛ اسے دیکھ کر مست مجلس ہوا
ہو ... کنول دیکھ تالاب میں ؛ عجب مست دستے ہیں سیراب میں
میٹھی باس پی ہے یو مد مالتی ؛ یو مستی یو ہستی کوں سب گھالتی
یو خوش باس سوں سب معطر ہے باغ ؛ اسی باغ سوں خوش ہوا ہے دماغ
مدن بان کا باس تو خاص ہے ؛ ولے موگرا اس سوں خوش باس ہے
یو چنپا لیا ہے عجب تلخ باس ؛ بھنور گرتے ہیں آن دیتا ہے باس
چمیلی میں ہے باس عروس کی ؛ کتے باس آتی ہے فردوس کی
پھولی ہے دیکھو کیتکی سر بسر ؛ تو قربان ہوتا ہے اس پر بھنور



عجائب دیکھو سیوتی کا بہار ؛ عجائب پھولی ریوتی بے شمار
چمن بیں عجائب نشیمن ہے یو ؛ عجب ٹھار دل کش سو دامن ہے یو
حجر ہور شجر مست سرشار ہیں ؛ ہمیشہ سدا مست دیدار ہیں

چمن میں پھولیا ہے یوں سارا گلاب ؛ طلب کر قوالاں کوں بیگی شتاب
دیکھو یار کوں کیوں رجھانے بدل ؛ خردساں یو مل نان گاتے پچھل
دیکھو طائراں مست ہو بولتے ؛ چھپے راز سب اس کے مرغولتے
کتک جانور بولتے خوش آواز ؛ امی یار کا راز کرتے ہیں واز
چمن در چمن دیکھ لالا ہے مست ؛ یو سرو سہی دیکھ بالا ہے مست
نقل کوں یہاں گنج در گنج ہے ؛ یو مے خوش عجب دیکھ نارنج ہے
عجائب ہے شیریں یہاں نیشکر ؛ مقابل کوں اس کے نہیں کچھ دگر
ولایت کے میوے تو اقسام ہیں ؛ ولے یہاں گلابی عجب جام ہیں
یہاں انبہ تو عام ہور خاص ہے ؛ پھنس سوں سرس یہاں اناس ہے
کتے جس کوں خمار کا کچھ ہے رنج ؛ او سے دور کرتا بھی کہتے ترنج
دیکھو یہاں عجائب ہے انار یو ؛ کتے دور کرتا ہے خمار یو

باغ و بہار کا یہ سماں معظم کے دل کو گرماتا ہے اور وہ ساقی سے شرابِ نغمہ کی فرمایش کرتے ہیں:

نقل ہے مہیا شراب و کباب ؛ منگا بیگ ساقی شرابِ رباب
مرے پر اِتا کیف غالب ہوا ؛ مرا راگ پر جیو طالب ہوا

مے و ساقی کی سرمستیوں اور باغ و بہار کی رنگینیوں کا بیان ہو چکا، اب مطرب و نغمہ کی ہوشس ربائی اور دل ستانی کا ذکر چھڑتا ہے:

مغنّی تو ہے آشنا یار کا ⁂ او مطرب تو محرم ہے اسرار کا
مغنّی زباں کوں درازی کرے ⁂ او مطرب کدھیں چنگ بازی کرے
ایتا مست ہوتے ہیں سب خاص وعام ⁂ ایتا مست ہوتی ہے مجلس تمام
اگر قول گاتے ہیں کچھ یو قوال ⁂ ایتا مست صوفی یو کرتے ہیں حال
مغنّی کے گانے پہ زہرہ بھی دنگ ⁂ اور مطرب بجاتا ہے جو موسوں چنگ
مغنّی تو کرتا زباں کا ہنر ⁂ او مطرب عجائب بجاتا جنتر
کرامت مغنّی کی ہے بات میں ⁂ سحر ہے یو مطرب کے کچھ ہات میں
او مطرب اگر ہات لیتا ہے دف ⁂ ایتا غم کوں کرتا ہے سب برطرف

نغمہ و سرور کی فضیلت اور اہمیت اور اس کے سحر و اعجاز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شاہ معظم بعض مسلمان موسیقاروں[1] کے اس خیال کو دہراتے ہیں کہ راگ درحقیقت عشق کی آگ ہے۔ جسم میں پہلے راگ آیا اور اس کی تلاش میں روح جسدِ خاکی میں داخل ہوئی۔ چناں چہ سید عبدالولی عزلت راگ مالا میں "عظمتِ سرود" کے عنوان کے تحت کہتے ہیں:

خدا نے جب تنِ آدم بنا کر ⁂ کہا اے روح تو جا اُس کے بھیتر
کیا عرض آہ بھر کر روح نے یوں ⁂ اندھیاری کوٹھری میں جا بسوں کیوں
کہا تب ایک ملک کو بیٹھ تن میں ⁂ تو بول ایک راگ آدم کے بدن میں
ملک سے سن کے تائیں درد کی کئی ⁂ دوانی ہو کے تن میں رُوح آ گئی
سروری سے ہوا ہے جیتا انساں ⁂ جو سچ بولوں تو تھا نغمہ وہی جاں[2]

شاہ معظم کے ذہن میں بھی مسلمان موسیقاروں کی یہی تاویل تھی، لیکن وہ عزلت کی طرح

---

[1] ملاحظہ ہو، غنچۂ راگ
[2] راگ مالا (۹۱) مثنویات، کتب خانۂ آصفیہ۔



تفصیل میں نہیں گئے ہیں بلکہ موسیقی کی اثر انگیزی اور اثر آفرینی کا بیان کرتے ہوئے اس طرف بھی اشارہ کر گئے ہیں:

بڑا علم قدرت میں یو راگ ہے ⁂ کتے راگ سو عشق کا آگ ہے
بھلاتا ہے محبوب کے غیر کوں ⁂ جلاتا ہے سب کفر ہور دیر کوں
اول تن میں یو راگ آیا کتے ⁂ مٹھے سُر سنا کر بلایا کتے
اوسی دن سوں ہے راگ میرا رفیق ⁂ اوسی دن سوں ہے راگ میرا شفیق
اسی راگ سوں راز ظاہر ہوا ⁂ چھپا راز پردے سوں باہر ہوا

راگ کو اصلِ حیات اور محرمِ اسرار ٹھہرانے کے بعد کہتے ہیں کہ یہ وہ طاقت ہے جس سے حیوانات، جمادات، اور نباتات بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ راگ میں وہ اثر ہے کہ ہرن چوکڑیاں بھرنا بھول جاتے ہیں، درندے رام ہو جاتے ہیں، لوہا موم بن جاتا ہے، سلاطین تخت و تاج لٹا بیٹھتے ہیں اور مہر و ماہ قدموں میں لوٹنے لگتے ہیں، اور سب تو سب:

کتے راگ زینت ہے قرآن کا

یہ راگ کیا ہے؟ ایک بات، ایک آواز، لیکن ایسی بات اور ایسی آواز، جس میں کرامت چھپی ہوئی ہے اور جو کوئی اس بات کو پالیتا ہے حق کو پا لیتا ہے:

عجب راگ کا جگ میں بستار ہے ⁂ شہد سوں مٹھا تر یو گفتار ہے
جسے راگ کہتے ہیں او بات ہے ⁂ ولے بات میں اس کرامات ہے
اگر کوئی جو پاتا ہے اس بات کوں ⁂ انپڑتا ہے سچ حق کی او ذات کوں

اس لیے شاہ معظم مغنّی اور مطرب کو آواز دیتے ہیں کہ وہ مجلس میں آئیں اور اپنی مسیحا نفسی کو کام میں لائیں:

اے مطرب بجا عود و بربط کے تار ⁂ جو نکلے صدا تس میں سب یادِ یار

یو جیو اس صدا پر سوں قربان ہے ؛ جتا مال دھن ہور ایمان ہے
مغنیؔ سنیا ہوں ترا خوش آواز ؛ کتے واز کرتا ہے سب دل کے راز
اے مطرب اگر چنگ ولے دف سوں مل ؛ کرے رقص تو صاف ہوتا ہے دل
کہ تا مست ہو وجد میں آئے ہیں ؛ ورا الورا پر گزر جاوے ہیں
مغنیؔ غزل قول کچھ یاد کر ؛ کدورت مرے دل سوں برباد کر
رہوں شاد شاداں ہو مل یار سوں ؛ کروں عشق مل اپنے دل دار سوں
اے مطرب بجا لے کتے جاں گداز ؛ جو مستاں کریں رقص کا اوڈھ کے ساز
کریں رقص ہو مست اِت شوق سوں ؛ بسر دین دنیا کوں اِت ذوق سوں
مغنیؔ ایتا کوی ترانہ سنا ؛ جو اوڈھ جاے دل سوں یہ سب میں پنا
ستوں ہات سوں دھو کے ہستی کے کام ؛ رہوں سرنگوں ہو کے تا صبح شام
اے مطرب دو تارے کوں دے گوشمال ؛ ایتا دیکھ آتا ہے مجلس کوں حال
تمارے یو گانے بجانے اوپر ؛ کتے مست ہوتے ہیں شمس و قمر

شاہ معظم راگ کو روح کا یار و مددگار سمجھتے ہیں اور ان کو یقین ہے کہ جراحتِ عشق کا مداوا اسی سے ممکن ہے :

کتے راگ ہے یار اس روح کا ؛ میرے سار کے سچ ہے مجروح کا

اس لیے مثنوی کو ختم کرتے ہوئے مغنیؔ اور مطرب سے درخواست کرتے ہیں :

دونو یار مل دست گیری کرو ؛ دونوں یار مل جہد پوری کرو
دونو یار مل کارسازی کرو ؛ مرے ہجر کے غم کو ماضی کرو
اگر جا کے ملنا ہو اس ماہ کوں ؛ حقیقت کہو جا کے سب شاہ کوں
مغنیؔ تو محرم ہے سب راز کا ؛ معظم ہے عاشق سو آواز کا

صوفی شعرا پر حقیقت کا رنگ کچھ ایسا غالب رہتا ہے کہ وہ کبھی مجاز کی طرف آتے



بھی ہیں تو ان کی شاعری میں مجاز حقیقت کا عکس دکھائی دینے لگتا ہے۔ معظم کے زیرِ نظر ساقی نامے کا موضوع بہ ظاہر مے و نغمے کا مجازی موضوع معلوم ہوتا ہے لیکن پوری مثنوی بارہا پڑھ جائیے اس کے باوجود یہ تصفیہ کرنا مشکل ہوگا کہ شاعر کے فکر و فن کو قوتِ محرکہ حقیقت سے مل رہی ہے یا مجاز سے۔ تاہم معظم کے یہاں یہ چیز کھٹکتی نہیں ہے، اس لیے کہ وہ مجاز و حقیقت کے تارِ حریرِ دو رنگ سے اپنی نظم کا تانا بانا تیار کرنے کا خاص سلیقہ رکھتے ہیں اور مجاز ہو یا حقیقت ان کی شاعری جذبات اور احساسات کی شاعری ہوتی ہے۔ وہ اصطلاحات کی زبان میں شعر کہتے ہیں اور نہ الفاظ کا طلسم باندھتے ہیں بلکہ تصوف کے نازک سے نازک مسئلے کو جذبات کی زبان میں بیان کرنے اور پیچیدہ مسئلہ کو سلیس اسلوب میں پیش کرنے پر قادر ہیں۔ زیرِ نظر ساقی نامے میں معظم نے سرور و سرود کا ذکر کچھ ایسے للچائے ہوئے انداز میں کیا ہے، جو بغیر شدید داخلیت کے ممکن نہیں۔ اسی شدید داخلیت کی وجہ سے ان کی زبان میں روانی اور اسلوب میں بے ساختگی پیدا ہوگئی ہے، جو بہت کم صوفی شعرا کے کلام میں ملتی ہے۔

# مفتاح الاسرار

شاہ معظم کی یہ مثنوی دراصل اُن کی روحانی سرگذشت کا ایک باب ہے، جو بجائے خود مکمل ہے۔ اس مثنوی کے پانچ نسخے دست یاب ہوئے ہیں، جن میں سے ہر ایک پر اس کا ایک علاحدہ نام لکھا ہے۔ ان نسخوں کی تفصیل حسب ذیل ہے:

### ۱۔ کتب خانۂ نواب سالار جنگ، حیدر آباد

مخطوطہ نمبر (۱۰۳) تصوف، تعداد صفحات (۲۲)، تعداد اشعار (۲۷۳)
سرنامہ ہے اور نہ ترقیمہ، البتہ کسی نے مثنوی کا نام "وجودیہ" لکھ دیا ہے۔ ہاشمی صاحب مرحوم نے بھی اپنی فہرست میں یہی نام دیا ہے۔[1] کاغذ قدیم دیسی ہے اور کتابت خط ثلث میں ہے، جس سے اس نسخے کی قدامت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

### ۲۔ کتب خانۂ انجمن ترقی اردو، ہند، دہلی

مخطوطہ نمبر (۷۰) تصوف، تعداد صفحات (۱۶) تعداد اشعار (۲۷۳)
ابتدائی صفحے پر مثنوی کا نام "مفتاح الاسرار" درج ہے، لیکن انجمن کے فہرست نگار

[1] کتب خانۂ نواب سالار جنگ مرحوم کی اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست، صفحہ ۲۰۱



نے مثنوی کا نام "مکتوبِ معظم یا مفتاح الاسرار" لکھا ہے۔[1] اس اضافے کی بظاہر وجہ وہ شعر معلوم ہوتا ہے، جس میں معظم نے اپنی مثنوی کو مکتوبِ معظم کہا ہے:

یو مکتوب معظم کہتے ٭ دیکھ عارف چھک کر رہتے

لیکن یہ مثنوی کا نام نہیں ہے، اس لیے کہ شاہ معظم اپنی نظموں کو بالعموم 'مکتوب' یا 'نامہ' کہتے ہیں:

یو مکتوب کیا جھاڑ ہے بار دار ٭ دیکھو سب یو وحدت سوں آیا ہے بار[2]
یو نامہ جہاں میں ہوا جب ختم ٭ اگیارا صدی میں اتھے تیس کم[3]

یہ نسخہ ایک ناقص الطرفین فارسی مثنوی کے ساتھ مجلد ہے۔ فارسی مثنوی کے صرف دو ورق ہیں۔ چوتھے ورق سے شاہ معظم کی مثنوی شروع ہوتی ہے، لیکن اس کا آخری ورق جلد سازی کے وقت غلطی سے فارسی مثنوی کے اوراق کے بعد اور اصل مثنوی سے پہلے لگ گیا ہے، یعنی بہ حالتِ موجودہ جو ورق نمبر (۳) ہے وہ دراصل ورق نمبر (۱۱) ہے۔
صفحات کی اس ترتیب کا پتا رکاب سے چلایا جا سکتا ہے۔
صفحات کی ترتیب کے اس معمولی انتشار سے قطع نظر یہ نسخہ مکمل ہے۔

### ۳۔ کتب خانۂ انجمن ترقی اردو، ہند، دہلی

مخطوطہ نمبر (۶۹) تصوف، تعداد صفحات (۳۰)، تعداد اشعار (۲۷۳)
یہ نسخہ مخطوطہ نمبر (۷۳ تصوف) کے ساتھ مجلد ہے۔ لوح پر "مکتوبِ حضرت

[1] اردو ادب، جلد ۴، نمبر ۲، بابت جون ۱۹۵۳ء، صفحہ ۱۴۱
[2] شجرۃ الاتقیا، مخطوطہ نمبر (۱۳۱) تصوف، کتب خانۂ نواب سالار جنگ، حیدر آباد
[3] معراج نامہ، کتب خانۂ جامعہ مسجد بمبئی۔

سلطان معظم" لکھا ہے اور یہی نام فہرست نگار نے بھی دیا ہے۔[1] ترقیمہ حسب ذیل ہے:

"تمت تمام شد، تاریخ بست و ششم ماہ مبارک محرم الحرام سنہ ۱۲۵۳ ہجری از ید احقر العباد غلام حسین موذن نوشتہ شد۔"

۴۔ کتب خانۂ قادر بادشاہ صاحب، حیدرآباد

تعدادِ صفحات (۲۵)، تعداد اشعار (۲،۷۳)

یہ نسخہ اُس مجموعے میں شامل ہے، جس میں شاہ معظم کی ایک اور مثنوی آزاد نامہ بھی ہے۔ لوح پر" طالب نامۂ معظم" لکھا ہے۔ اس نسخے کا سنہ کتابت سنہ ۱۲۶۰ ہجری ہے۔

۵۔ کتب خانۂ درگاہ حضرت امین الدین علی اعلیٰ، بیجاپور

تعدادِ صفحات (۲۰)، تعدادِ اشعار (۲،۷۴)

یہ انتہائی خستہ اور کرم خوردہ نسخہ ہے، جس کی لوح پر مفتاح الاسرار درج ہے اور خاتمے پر سنہ کتابت اس طرح لکھا ہے:

"در اوائلِ سالِ جلوس سید شاہ علی پیرا بن سید باباشاہ حسینی قدس اللہ سرہ العزیز تحریر نمودہ"

حضرت علی پیر سنہ ۱۱۱۹ ہجری میں سجادہ نشین ہوئے۔ قطعۂ تاریخِ جلوس حسبِ ذیل ہے:

آفتاب آمد بروں یا از صحاب ٭ شاہ آمد در جلوس کامیاب
چوں علی بعد از محمد در جہاں ٭ آفتاب آمد وصیِ آفتاب[2]

---

[1] رسالۂ اردو ادب، بابت جون سنہ ۱۹۵۳ء، صفحہ ۱۴۱
[2] بیاض کتب خانہ درگاہ حضرت امین الدین علی اعلیٰ۔ بیجاپور



شاہ معظم نے حضرت علی پیر کا ابتدائی زمانہ[1] دیکھا ہے اور ان کی مدح بھی کی ہے۔[2] اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ زیرِ نظر نسخہ اُن کی زندگی ہی میں لکھا گیا ہے۔

گنج مخفی کی طرح شاہ معظم کی زیرِ تبصرہ مثنوی کا نام "وجودیہ" اور مکتوبِ معظم" بھی غیر موزوں معلوم ہوتا ہے۔ وجود کے مسائل زیر بحث آنے کے باوجود اُن کی حیثیت مثنوی میں مرکزی نہیں ہے۔ اس مثنوی میں شاہ معظم نے دراصل اپنی روحانی سرگذشت کا ایک باب پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ حضرت قادر لنگا کو تال کے مرید ہونے کے باوجود وہ اپنے دادا پیر حضرت امین کے طالب کیوں ہوئے اور حضرت امین نے اُنھیں کن کن مسائل کی تعلیم دی اور کس طرح مختلف مدارج اور مقامات طے کرائے۔ وجود کے مراتب و منازل اور اُن کے اسرار و رموز اسی تعلیم و تربیت کے ضمن میں آگئے ہیں۔ اس لیے راقم الحروف کا خیال ہے کہ اس مثنوی کا نام وجودیہ کی بجائے مفتاح الاسرار یا طالب نامہ ہونا چاہیے، بلکہ ان دو ناموں میں بھی طالب نامہ زیادہ موزوں اور جامع نام ہے، لیکن اس مثنوی کے قدیم ترین نسخے میں جو کہ مصنف کی زندگی ہی میں لکھا گیا ہے، اس کا نام "مفتاح الاسرار" درج ہے، اس لیے مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس مثنوی کو "مفتاح الاسرار" ہی کے نام سے موسوم کیا جائے۔

جہاں تک موضوع کا تعلق ہے شاہ معظم نے اس مثنوی میں بھی اپنے خانوادے ہی کی تعلیمات بیان کی ہیں، لیکن مضامین کی ترکیب و ترتیب، بیان کے ربط و تسلسل، زبان کی شگفتگی و سلاست اور ہیئت کی خوش ترکیبی و ہم آہنگی نے ان میں نئی جان ڈال دی ہے اور ایسے قاری کو بھی جو خانوادۂ امینیہ کے نصاب و نظام تصوف کی

---

[1] شجرۃ الاتقیا مخطوطہ نمبر (۱۳۱) تصوف، کتب خانہ نواب سالار جنگ، حیدرآباد
[2] شجرۃ الاتقیا مخطوطہ نمبر (۱۳۲) تصوف، کتب خانہ نواب سالار جنگ و دیوانِ معظم مخطوطہ نمبر (۱۷) دواوین کتب خانۂ انجمن ترقیِ اردو ہند، علی گڑھ۔

ابجد سے تک ناواقف ہے، اس مثنوی کا مطالعہ گراں نہیں گزرتا بلکہ اظہار و اسلوب کی سلاست اور خوش آہنگی کا کچھ ایسا طلسم بندھتا ہے کہ وہ اسی میں کھو کر رہ جاتا ہے اور نئے مفاہیم اور غیر مانوس اصطلاحوں کی طرف اس کا ذہن منتقل ہی نہیں ہوتا۔

مثنوی کا آغاز حمد سے کیا ہے، جو (۳۳) اشعار پر مشتمل ہے۔ حمد میں اسما و صفات کی چگونگی اور صوفیانہ نکتہ پردازی کی بجائے کائنات کی رنگا رنگی اور مخلوقات کی بوقلمونی کا ذکر انتہائی لطیف اور شاعرانہ انداز میں کیا ہے اور ان آیات اللہ کے حسن کا دل کش مرقع کھینچ کر ذہن کو خالقِ کائنات کی عظمت اور اُس کی حسن کارانہ رفعت کی طرف اس چابک دستی کے ساتھ راجع کیا ہے کہ دقیق سے دقیق مسائل اور نازک سے نازک نکات بیان کر کے بھی ایسی کامیابی حاصل کرنا ممکن نہیں۔

دکھنی شاعری میں حمد نگاری کی روایت بہت عام رہی ہے۔ مثنوی نگاری کی مقبولیت نے اس روایت کو اور چمکا دیا۔ ان حمدیہ نظموں میں شعرا نے بڑا زورِ بیان صرف کیا ہے اور فکر و فن کا کمال دکھایا ہے۔ نصرتی، غواصی، ابن نشاطی، صنعتی اور عشرتی وغیرہ کی پرشکوہ حمدیہ نظموں کا جواب نہیں ہے لیکن جو سادگی اور پرکاری، خلوصِ جذبات اور جوشِ بیان شاہ معظم کے ہاں ملتا ہے وہ بہت کم کہیں اور نظر آئے گا۔ خصوصاً عجائباتِ عالم کی عکاسی کے جو سادہ لیکن دل کش مرقعے معظم کے ہاں ملتے ہیں کسی اور حمد میں نظر سے نہیں گزرے۔

مثنوی کا آغاز حمد کے ان اشعار سے ہوتا ہے:

یو اللہ ناؤں پیارا ٭ دو عالم سمرے سارا
یو ذاتی ناؤں کتے ہیں ٭ او چیتے توچہ رہتے ہیں
تو قادر آپ کو اتا ٭ دو عالم کو توں بھاتا
اود حاکم تج کو کہتے ٭ اور ڈر میں تیرے رہتے



توں حاکم حکمت پورا ٭ تھیں کرتا کار ادھورا

حمد ہی کے سلسلے میں کارخانۂ قدرت کے حیران کن عجائبات کا ذکر کرتے ہیں:

بن کھام منڈف کیوں چھایا ٭ اور قندیلاں کیا خوب لایا
کردیں سورج سے روشن ٭ اور رات چندر سے گلشن
یو قطب دیکھو نیں ہلتا ٭ نا ہلتا ہے نا چلتا
ہے چندنی رات اوجیاری ٭ کیا پیاری رین اندھیاری

غیر ذی روح عجائباتِ عالم کے ذکر کے بعد بڑی خوب صورتی سے گریز کرتے ہوئے وہ انسانوں کی طرف آتے ہیں:

جیوں زیب فلک پر تارے ٭ انسان زمیں پر سارے
کیا حاکم حکمت کیتا ٭ یوں زیب دھرت کو دیتا
کوئی نبی کیا کوئی مرسل ٭ تھے ایکس سوں یک افضل
یو ولی کیا کیا پیارے ٭ ہیں ایکس سوں یک نیارے

شاعر چوں کہ انبیا اور اولیا کو مقصدِ کائنات اور حاصلِ موجودات تصور کرتا ہے، اس لیے اُن کو فرشِ زمیں پر روشن ستاروں سے تشبیہ دیتا ہے اور جمالِ روحانی کے ذکر کے بعد جمالِ جسمانی کی طرف رجوع کرتے ہوئے ہو شانِ عالم کے حسن کی سحر آفرینی کو خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے:

معشوق کیا کیا بالی ٭ جیوں پھول کنول کی ڈالی
کیا میٹھی اُس کی باتیں ٭ کیا کنول سری کے ہاتیں
کیا نین دیکھو رتنالی ٭ کیا کاکل گھنگر والی
کیا عاشق مدکی ماتی ٭ کیا ڈولتی خوب سہاتی
کیا باغاں اور امرایاں ٭ کیا رو توں باروں آیاں

ابجد سے تک ناواقف ہے، اس مثنوی کا مطالعہ گراں نہیں گزرتا بلکہ اظہار و اسلوب کی سلاست اور خوش آہنگی کا کچھ ایسا طلسم بندھتا ہے کہ وہ اسی میں کھو کر رہ جاتا ہے اور نئے مفاہیم اور غیر مانوس اصطلاحوں کی طرف اس کا ذہن منتقل ہی نہیں ہوتا۔

مثنوی کا آغاز حمد سے کیا ہے، جو (۳۳) اشعار پر مشتمل ہے۔ حمد میں اسما و صفات کی چگونگی اور صوفیانہ نکتہ پردازی کی بجائے کائنات کی رنگارنگی اور مخلوقات کی بوقلمونی کا ذکر انتہائی لطیف اور شاعرانہ انداز میں کیا ہے اور ان آیات اللہ کے حسن کا دل کش مرقع کھینچ کر ذہن کو خالقِ کائنات کی عظمت اور اُس کی حسن کارانہ رفعت کی طرف اس چابک دستی کے ساتھ راجع کیا ہے کہ دقیق سے دقیق مسائل اور نازک سے نازک نکات بیان کر کے بھی ایسی کامیابی حاصل کرنا ممکن نہیں۔

دکھنی شاعری میں حمد نگاری کی روایت بہت عام رہی ہے۔ مثنوی نگاری کی مقبولیت نے اس روایت کو اور چمکا دیا۔ ان حمدیہ نظموں میں شعرا نے بڑا زورِ بیان صرف کیا ہے اور فکر و فن کا کمال دکھایا ہے۔ نصرتی، غواصی، ابن نشاطی، صنعتی اور عشرتی وغیرہ کی پرشکوہ حمدیہ نظموں کا جواب نہیں ہے لیکن جو سادگی اور پرکاری، خلوصِ جذبات اور جوشِ بیان شاہ معظم کے ہاں ملتا ہے وہ بہت کم کہیں اور نظر آئے گا۔ خصوصاً عجائباتِ عالم کی عکاسی کے جو سادہ لیکن دل کش مرقعے معظم کے ہاں ملتے ہیں کسی اور حمد میں نظر سے نہیں گزرے۔

مثنوی کا آغاز حمد کے ان اشعار سے ہوتا ہے:

یو اللہ ناؤں پیارا ∗ دو عالم سرے سارا

یو ذاتی ناؤں کتے ہیں ∗ او چیتے توجہ رہتے ہیں

تو قادر آپ کو اتا ∗ دو عالم کو توں بھاتا

او عالم تج کو کہتے ∗ او ڈر میں تیرے رہتے



توں حاکم حکمت پورا ∗ تھیں کرتا کار ادھورا

حمد ہی کے سلسلے میں کارخانۂ قدرت کے حیران کن عجائبات کا ذکر کرتے ہیں:

بن کھام منڈف کیوں چھایا ∗ اور قندیلاں کیا خوب لایا

کر دیس سورج سے روشن ∗ اور رات چندر سے گلشن

یو قطب دیکھو نیں ہلتا ∗ نا ہلتا ہے نا چلتا

ہے چندنی رات اوجیاری ∗ کیا پیاری رین اندھیاری

غیر ذی روح عجائباتِ عالم کے ذکر کے بعد بڑی خوب صورتی سے گریز کرتے ہوئے وہ انسانوں کی طرف آتے ہیں:

جیوں زیب فلک پر تارے ∗ انسان زمیں پر سارے

کیا حاکم حکمت کیتا ∗ یوں زیب وحرت کو دیتا

کوئی نبی کیا کوئی مرسل ∗ تھے ایکس سوں یک افضل

یو ولی کیا کیا پیارے ∗ ہیں ایکس سوں یک نیارے

شاعر چوں کہ انبیا اور اولیا کو مقصدِ کائنات اور حاصلِ موجودات تصور کرتا ہے، اس لیے اُن کو فرشِ زمیں پر روشن ستاروں سے تشبیہ دیتا ہے اور جمالِ روحانی کے ذکر کے بعد جمالِ جسمانی کی طرف رجوع کرتے ہوئے ہو شانِ عالم کے حسن کی سحر آفرینی کو خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے:

معشوق کیا کیا بالی ∗ جیوں پھول کنول کی ڈالی

کیا میٹھی اُس کی باتیں ∗ کیا کنول سری کے ہاتیں

کیا نین دیکھو رتنالی ∗ کیا کاکل گھنگر والی

کیا عاشق مد کی ماتی ∗ کیا ڈولتی خوب سہاتی

کیا باغاں اور امرایاں ∗ کیا رو توں باروں آیاں

دیکھ سروِ سہی کیوں ہلتے ٭ شمشاد چمن میں ڈولتے
یوں صدقہ ہوتے اُس پر ٭ جن جان دیا ہے تس پر
کیا ہری ہری ہریالی ٭ کیا نیلی، پیلی، کالی
کیا جھاڑاں چھتوا چھائے ٭ پر بادوں سیس نوائے
کیا لالہ لہلہاتا ٭ پھل پھولوں باغ سہاتا

حسنِ فطرت کے بیان سے بڑی خوب صورتی کے ساتھ گریز کر کے وہ نعتِ رسول شروع کرتے ہیں۔ یہ گریز ایسا حسین اور فن کارانہ ہے کہ قصیدے کے گریز کا لطف آجاتا ہے، اور یہ معظم کے طرزِ بیان کی نمایاں خصوصیت ہے کہ وہ ایک موضوع سے دوسرے موضوع کی طرف ایسی چابک دستی اور لطافت کے ساتھ رجوع کرتے ہیں کہ موضوع کی تبدیلی کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ اس مثنوی میں بھی اس کمالِ فن کے نمونے جگہ جگہ ملتے ہیں، چناں چہ مخلوقاتِ عالم کی رنگارنگی کا ذکر کرتے ہوئے وہ حمد سے نعت کی طرف یوں گریز کرتے ہیں:

یو خالق خلقت کیتا ٭ سرتاج نبی کے دیتا
یو کاج نبی کے سارا ٭ ہے نبی اللہ کا پیارا
ترلوک کیا اُس کارن ٭ اُس کیتا دو جگ تارن

نعت کے بعد صحابہ، پنجتنِ پاک، دوازدہ امام اور چہاردہ معصومین کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ یہ گویا تمہید تھی، جس کو ختم کرتے ہوئے وہ افسانوی انداز میں اصل موضوع کی طرف آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایک رات مجھے یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ انسان کی پیدائش کا کیا مقصد ہے؟ مجھے کس نے بنایا ہے؟ میں نے اس دنیا میں آکر کیا کام کیا؟ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے آنکھیں عطا کی ہیں تو مجھے چاہیے کہ آنکھیں دینے والے کو دیکھوں، اُس سے بات کروں اور پوچھوں کہ میرے اندر میں پن کا احساس



ہے تو یہ میں کون ہے:

اِک رات فکر میں کیتا ٭ مجھ جنم کنے یو دیتا
کیا کام کیا میں آکر ٭ یو نعمت اُس کی کھاکر
یو نین دیا جن مج کو ٭ میں دیکھوں بارے اُس کو
اِس نینو اُس کو دیکھوں ٭ کیوں ایک کتے سو لیکھوں
کچھ اس سوں بولوں بارے ٭ جن سرجا عالم سارے
ہیں میں یو کہتا سو کون ٭ یہاں حق ہو رہتا سو کون

اسی ادھیڑ بن میں آنکھ لگ گئی اور میں نے خواب میں دیکھا کہ رسولِ کریم صلعم کی بارگاہ میں حاضر ہوں۔ سرکار نے مجھے پیار کیا اور فرمایا کہ ہذا منی اور مجھے علمِ لدنی کی تعلیم فرمائی۔ میں نے سر بہ زمین ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں آپ کے دوامِ حضور کا طالب ہوں۔ اس کے سوا کوئی آرزو اب دل میں نہیں رہی۔ یہ سن کر حضور نے ارشاد فرمایا: معلوم ہوتا ہے کہ تجھے خدا کی طلب ہے، اچھا اب بیجاپور جا، وہاں ایک مقام شاہ پور ہے، جہاں امین علی پیر رہتے ہیں، ان کا طالب ہو۔ میں نے حضورِ اکرم صلعم کے حکم کی تعمیل کی اور حضرت امین کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انھوں نے اوامر و نواہی سے آگاہ اور اسرار و رموز سے باخبر کیا اور فرمایا کہ یہ بات میں امرِ نبی کی متابعت میں کہ رہا ہوں کہ لے معظم تیرا پیر قادر ہے۔ وہ حاضر اور تو ناظر ہے، اُس کو اپنے دل میں بسا لے اور اُس کا دامن پکڑ کر راہِ سلوک اختیار کر۔

معظم اس طرح حمد، نعت، منقبت، طلبِ حق، بشارتِ نبوی، حضرت امین کی خدمت میں حاضری اور اُن کے حکم پر قادر لنگا کوتال سے اپنی وابستگی کا ترتیب وار ذکر کرنے کے بعد اپنے دادا پیر سے حاصل کی ہوئی، سلوک و معرفت کی تعلیم کو اسی ترتیب کے ساتھ بیان کرتے ہیں جو خانوادۂ امینیہ کے صوفیہ کا خاصہ ہے، لیکن ان بزرگوں اور

معظم میں یہ فرق ہے کہ وہ ایک معلم اور مبلغ کی طرح تفصیلات اور جزئیات کے کسی پہلو کو نظر انداز نہیں کرتے اور ساری تفصیلات، اصطلاحات کی زبان میں بیان کرتے ہیں۔ معظم صوفی ہی نہیں ایک خوش فکر اور قادر الکلام شاعر بھی ہیں، اس لیے وہ جزئیات اور تفصیلات میں الجھنے اور اصطلاحات کی زبان استعمال کرنے کی بجائے شاعرانہ زبان میں صرف اشارہ و ایما سے کام لیتے ہیں، جس کی وجہ سے وہی باتیں، جو دوسروں کے ہاں علمی تقشف کے باعث بے کیف، جزئیات کی پیچیدہ تفصیل کی وجہ سے چیستاں اور اصطلاحات کی کثرت کی وجہ سے غیر دلچسپ اور نا قابل فہم ہو گئی ہیں، معظم کے ہاں شگفتگی اور تازگی، ندرت اور خوش آہنگی کا احساس پیدا کرتی ہیں

بہر حال شاہ معظم اپنے خانوادے کی روایت کی بہ موجب چاروں مراتب وجود ان کے مقام، باٹ، ذکر، قلب، روح، نفس، عقل، موکل، شہادت اور منزل کی وضاحت کرتے ہیں۔ وجود کے پہلے مرتبے یعنی واجب الوجود کے ذکر میں اس کے دسوں خصائص بیان کرنے کے بعد چھ غفلتوں، سات مستیوں، پانچ جوہروں اور ان کے چوروں کی طرف بھی اشارے کیے ہیں۔ یہ ان کے دادا پیر کا محبوب موضوع ہے، لیکن معظم نہ تو اس کی تفصیل میں گئے ہیں اور نہ اس کو منثر کی طرح دہرایا ہے۔

ان خشک مسائل کے روایتی مباحث کو پیش کرنے میں معظم نے جو شاعرانہ اسلوب اختیار کیا ہے، اس کا اندازہ وجود کے چوتھے مرتبے "عارف الوجود" کے مطالعے سے کیا جاسکتا ہے:

تھا منزل لاہوت دور ❊ مجھ جانا دیکھ ضرور
تب عارف تازی چڑ کر ❊ شمشیر سری ہت دھر کر
او تازی لئی ہے چنچل ❊ ہے چنچل اور لئی اچپل
اس تازی پر ہوا سوار ❊ تب چڑ کر نکلا بھار



تھا ملہمہ یک مو اس ❊ میں اوس سوں با اخلاص
جب منزل لاہوت پہونچا ❊ تھا جا گا لئی او اونچا
وھاں دیکھا عزرائیل کو ❊ تب دہشت لاگا دل کو
ہے بندے کا یھاں لگ حد ❊ جھاں گھاٹ بجے ان حد
مجھ حق نے کیتا فاضل ❊ القاب دیا تب واصل
اس کہتے سو دھا بندا ❊ جن پایا شہادت شہدا

چوتھے مرتبۂ وجود کے بیان کو معظم نے "دربیانِ راہِ معرفت" کی سرخی دی ہے۔ اس مرتبے کی دسوں خصوصیات بیان کرنے کے بعد وہ اس مرتبے میں معرفتِ الٰہی کی تفصیل پیش کرتے ہیں:

اس کہتے خفی کا حال ❊ اس کہتے قرب محال
یھاں دیکھا بیچوں اس کو ❊ اور صاحب سمجھا تس کو
نا ہوش رہا کچھ تج میں ❊ حیران اتھا اس بوج میں (بُوجھ)
یا خواب کہوں بیداری ❊ یا نیند کہوں ہشیاری
یا اللہ کہوں یا بندا ❊ یوں روشن دیکھ تجلا
او کیف مرے پر دائم ❊ او دائم ہے اور قائم
مدہ ماتا توجہ رہتا ہوں ❊ اور وھاں کا راز کتا ہوں
جوں سُنا گُڑ کے بینو (دگرو) ❊ ووں دیکھا اپنے نینو

اس مرتبے کی کیفیات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

میں صدقہ امین علی کا ❊ وو حق کے دیکھ ولی کا
مجھ سیدی راہ چلایا ❊ میں پیر میں حق کو پایا
میں پیر میں حق کو دیکھا ❊ بر حق ہے حق کر لیکھا

اسی سلسلے میں کہتے ہیں کہ شیخ مظہرِ تجلیاتِ الٰہی ہوتا ہے۔ سیر اللہ فی الشیخ یہی ہے کہ مرید شیخ کو صورت تشبیہ سمجھے اور اس میں تجلیاتِ الٰہی کا مشاہدہ کرے۔ اللہ تعالیٰ میرے شیخ کا بھیس بدل کر آیا ہے لیکن جس طرح ہرکارے کے بھیس میں بھی نوشابہ نے سکندر کو پہچان لیا تھا اسی طرح میں نے اپنے شیخ کو پہچان لیا ہے۔

شیخ کو تجلیِ الٰہی کہنا کفرِ حقیقی ہے، لیکن عاشق اس کفرِ حقیقی کو عینِ ایمان جانتا ہے۔ معظم اپنے اس بیان کی تائید میں تمام کبار اولیا اور مشاہیر کے حوالے دیتے جاتے ہیں، جن میں سعدی، حافظ، حضرت غوثِ اعظم، شمس تبریز، مولانا روم، بایزید بسطامی، معین الدین چشتی، قاضی عین القضات، منصور حلاج، اور جنید بغدادی قابلِ ذکر ہیں۔

معرفتِ تامہ کی کیفیات کی وضاحت کے بعد معظم بارگاہِ ایزدی سے اپنی سرفرازیوں کا ذکر کرتے ہیں۔ اپنے متعلق اس طرح کا اظہار اولیاے کبار کا خاصہ رہا ہے، معظم کے بیان سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو سلوک و معرفت کی معراج کمال تک پہنچا دیا تھا:

میں اپس یوں پنچھ گنوایا ٭ تب لذت کچھ میں پایا
سب رویت مجھ پر کھولا ٭ اور بات خفی کی بولا
تھا مجھ پر پیار ول سوں ٭ تھا مجھ پر رحم ازل سوں
مجھ دے کر پانچوں گنج ٭ کر دور سینے سوں رنج
تب امت نبی کا کیتا ٭ اور کسب علی کا دیتا
حق دیکھ شجاعت میرا ٭ تب کیتا پیار گھنیرا
کئی بار لڑایا مجھ کو ٭ کئی کھیت چڑایا مجھ کو
اپ تاج فقر کا دیتا ٭ اور سلطان معظم کیتا
مجھ راز کیا حق ظاہر ٭ مجھ اپنا کر کر ماہر



حق دیتا مج کو شاہی ٭ ہے روشن مرغ و ماہی
دے تاج فقر کا افسر ٭ ہے پتّر سر پر چھتّر
اس پتّر میں کی کچھ دیتا ٭ منگ عالم مجھ سوں لیتا
میں مر مر کر پھر آیا ٭ تب گنج خفی میں پایا
میں مر مر چاروں تن سو ٭ تب پایا لذت اس فن سو
میں توجہ تصرف کرتا ٭ او نعمت کچھ نیں سرتا
میں جان تصدق دیتا ٭ تب مج کو محرم کیتا

اپنی سرفرازیوں کو گنانے کے بعد وہ کہتے ہیں کہ یہ مقام یوں ہی حاصل نہیں ہوتا۔ یہاں سر کی بازی لگانی پڑتی ہے۔ اس سیڑھی پر سر کے بل چڑھنا پڑتا ہے، لیکن اس جاں نثاری اور سرفروشی کے باوجود مقصود کے پانے کی کوئی ضمانت نہیں۔ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے، اسی کو سرفراز کرتا ہے۔

اس تصریح کے بعد وہ پھر ایک بار حمد و ثنا اور پنجتن پاک کا ذکر کرتے اور اپنے پیر قادر لنگا کے لطف و عطا کے بیان پر مثنوی کو ختم کرتے ہیں:

یو مکتوب معظم کہتے ٭ دیکھ عارف جھک کر رہتے
خود قادر پیار کیا ہے ٭ مج رویت آپ دیا ہے
میں عاجز اور میں مظلوم ٭ او صاحب حی القیوم
مجھ را کھا ناوں معظم ٭ اور اپنا کیتا محرم

جیسا کہ ابتدا میں وضاحت کی گئی ہے، شاہ معظم کی یہ مثنوی ہیئت کے اعتبار سے بہت منظم و مرتب ہے۔ ہیئت کی یہ تنظیم و تکمیل شاہ معظم کی مثنویوں کی اہم اور نمایاں خصوصیت ہے، جس سے ان کی فن کارانہ صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ اپنی دوسری منظومات کی طرح شاعر نے اس مثنوی میں بھی بوجھل

اصطلاحات سے احتراز کیا ہے، یہی نہیں بلکہ روایتی مضامین اور مسائل کے بیان کو اپنے قلب کے گداز، جذبات کی تپش اور تخیل کی شوخی سے ایک نیا رنگ اور آہنگ بخشتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے صوفی شعرا کے برخلاف شاہ معظم کی شاعری فکر سے زیادہ جذبات اور احساسات کو تحریک دیتی اور قلب و نظر کو گرماتی ہے۔

دوسرے صوفی شعرا کی طرح معظم بھی اپنے عہد کے سرمایۂ لفظی ہی سے استفادہ کرنے پر مجبور ہیں، لیکن ان کا ذوقِ شعری اس سرمایے سے بڑے ہلکے پھلکے اور بولتے ہوئے الفاظ کا انتخاب کرتا ہے، اور وہ ان الفاظ کو اس سلیقے سے برتتے ہیں کہ خشک مضامین کی گرانی کے باوصف اُن کی نظم جذبات کا سیلِ رواں معلوم ہونے لگتی ہے۔ تصوف کے علمی مضامین کے بیان میں زبان اور اسلوب کا یہ نکھار آج بھی فن کے اونچے سے اونچے معیار پر کمالِ سخن وری کی ضمانت ہوسکتا ہے۔

نوٹ: ابونصر خالدی صاحب نے کسی تمہیدی یا تعارفی نوٹ کے بغیر اس مثنوی کو نوائے ادب بابت اپریل سنہ ۱۹۷۳ء میں چھاپ دیا ہے۔ انھوں نے اگرچہ حوالہ نہیں دیا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پیشِ نظر صرف سالار جنگ کا مخطوطہ رہا ہے۔



# آزاد نامہ

شاہ معظم نے اس مثنوی میں مردِ آزاد کے ظاہر و باطن پر روشنی ڈالی ہے۔ اس مثنوی کے نسخے مختلف ناموں سے ملتے ہیں، جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ کتب خانۂ نواب سالار جنگ، حیدرآباد

مخطوطہ نمبر (۱۴۸) تصوف، تعدادِ تصوّف (۱۲)، تعداد اشعار (۱۴۷)

کاتب نے مثنوی اور مصنف کا نام کہیں درج نہیں کیا ہے، البتہ بعد میں کسی نے لوح پر "گنج مخفی" لکھ دیا ہے۔ نصیر الدین ہاشمی مرحوم نے بھی اپنی فہرست میں یہی نام بتایا ہے[1]۔ کوئی ترقیمہ نہیں ہے، لیکن مثنوی کے خاتمے پر "قطعۂ تاریخ وصال حضرت فقیہہ المقدم باعلوی" درج ہے اور ہندسوں کے علاوہ الفاظ میں بھی سنہ لکھا ہے:

"۶۶۹ ہجری، شش صد و شصت و نہ سال بود۔ ناظم ایں تاریخ قاضی محمود است۔"

اسی سلسلے میں بعد میں کسی نے یہ عبارت مستزاد کی ہے:

---

۱؎ کتب خانۂ نواب سالار جنگ مرحوم کی اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست، صفحہ ۲۰۰

"اور خلقت حضرتِ مذکور کی اب تک جاری ہے۔ سو نے وغیرہ سنہ ۱۲۴۴ ہجری"
آخری سنہ سے پتا چلتا ہے کہ زیرِ نظر مخطوطے کی کتابت سنہ ۱۲۴۴ ہجری سے پہلے
ہوئی ہے۔ کاغذ اور خط کے پیشِ نظر قرینہ اس کا ہے کہ اصل مخطوطے کی کتابت اس سنہ
سے بہت پہلے غالباً گیارھویں صدی میں ہوئی ہوگی۔

یہ نسخہ دراصل شجرۃ الاتقیا، گلزارِ چشت اور وجود العارفین کے ساتھ مجلد تھا،
لیکن اب علاحدہ کر دیا گیا ہے۔ یہ تمام رسائل ایک ہی کاتب کے لکھے ہوئے ہیں، خط
ثلث اور کاغذ قدیم دیسی ہے، جس سے اس کی قدامت کا اندازہ ہوتا ہے

**۲۔ کتب خانہ نواب سالار جنگ، حیدر آباد**

مخطوطہ نمبر (۱۴۹) تصوف، تعدادِ صفحات (۹)، تعدادِ اشعار (۱۴۴)

یہ نسخہ شاہ معظم ہی کے ایک قصیدے اور الف نامے (سی حرف) کے
علاوہ شاہ برہان الدین جانم کی نظم وصیت الہادی کے ساتھ مجلد ہے۔ لوح پر "آزاد نامۂ
گفتارِ معظم" لکھا ہے، لیکن ہاشمی مرحوم نے فہرست میں اس کا نام "گنج مخفی آزاد نامۂ
گفتار معظم" بتایا ہے۔[1]

**۳۔ کتب خانہ نواب سالار جنگ، حیدر آباد**

مخطوطہ نمبر (۱۵۰) تصوف، تعدادِ صفحات (۱۳)، تعداد اشعار (۱۴۵)

یہ نسخہ تلاوت الوجود اور بعض مجہول الاسم رسائل کے ساتھ ایک مجموعے میں
شامل ہے، لوح یا خاتمے پر مصنف اور مثنوی کا نام کہیں درج نہیں ہے، لیکن آخری

---

۱؎ کتب خانۂ نواب سالار جنگ مرحوم کی اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست، صفحہ ۲۰۰



بیت میں اس کا نام قلندر نامہ بتایا گیا ہے۔

مرتب قلندر یو نامہ تمام ٭ علیک الصلوٰۃ و علیک السّلام

یہ بیت کسی اور نسخے میں نہیں ہے۔ اس لیے اس کو الحاقی سمجھنا چاہیے۔ ہاشمی مرحوم
نے فہرست میں گنج مخفی نام بتایا ہے۔[1]

اس نسخے کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ آیات، احادیث، اور اقوال کی سرخیوں
کے تحت شعر لکھے گئے ہیں۔ بعض سرخیاں یہ ہیں:

خلقت الملائک من نور الانسان وخلقت الانسان من نوری

کنت کنزاً مخفیاً فاحببتُ ان اعرف فخلقت الخلق

احمد بلا میم

اللّٰہ الغنی و انتم الفقرا

من کان فی ھذہٖ اعمیٰ فھو فی الاٰخرۃ اعمیٰ

کاتب بدخط اور کم سواد ہے۔ بعض جگہ عربی عبارت کے ساتھ ہی شعر نقل کرنے شروع کر دیے
ہیں، جس کی وجہ سے مصرعے مقدم موخر ہو گئے ہیں۔

**۴۔ کتب خانۂ نواب سالار جنگ، حیدر آباد**

مخطوطہ نمبر (۲۷) تصوف، تعدادِ صفحات (۱۱)، تعدادِ اشعار (۱۴۱)

"قصیدۂ قادر در مدح میراں جی شمس العشاق" (بشارت الانوار) اور
شکار نامے کے ساتھ یہ نسخہ مجلد ہے۔ سرنامہ اور ترقیمہ ہے اور نہ مصنف اور مثنوی
کا نام۔ ہاشمی مرحوم نے فہرست میں گنج مخفی نام بتایا ہے۔[2]

---

۱؎ کتب خانۂ نواب سالار جنگ مرحوم کی اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست، صفحہ ۲۰۱

۲؎ کتب خانۂ نواب سالار جنگ مرحوم کی اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست، صفحہ ۲۰۱

## ۵۔ کتب خانۂ ادارۂ ادبیات اردو، حیدر آباد

مخطوطہ نمبر (۶۵۵)، تعدادِ صفحات (۸)، تعداد اشعار (۱۰۰)

یہ ناقص الاول نسخہ ہے، جس کا آغاز حسب ذیل شعر سے ہوتا ہے:

دیکھو حق سوں رہتے اہیں بے نیاز ؛ دیکھو حق ہے ان پر الپس با نیاز

کوئی ترقیمہ نہیں ہے۔ ڈاکٹر زور نے گنج مخفی کے نام سے اس نسخے کو متعارف کرایا ہے اور اُن کا خیال ہے کہ اس کی کتابت بارھویں صدی کی ہوگی۔[1]

## ۶۔ کتب خانۂ انجمن ترقی اردو، ہند، دہلی

مخطوطہ نمبر (۷۳)، تصوف، تعداد صفحات (۱۰)، تعداد اشعار (۱۴۴)

اس مثنوی کے ساتھ شاہ معظم کی ایک اور مثنوی "مکتوبِ سلطان معظم" مجلد ہے، جس پر سنہ کتابت سنہ ۱۲۵۳ ہجری درج ہے۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ زیرِ نظر نسخے کا سنہ کتابت بھی یہی ہوگا۔ اس نسخے پر مثنوی کا نام درج نہیں ہے لیکن انجمن کے فہرست نگار نے گنج مخفی لکھا ہے۔[2]

## ۷۔ کتب خانۂ انجمن ترقی اردو، ہند، دہلی

مخطوطہ نمبر (۷۴)، تصوف، تعداد صفحات (۱۳)، تعداد اشعار (۱۵۰) اندازاً

یہ نسخہ انتہائی کرم خوردہ ہے۔ جلٹنگ پیپر لگا کر محفوظ کیا گیا ہے۔ اکثر مصرعے اور بعض شعر ضائع ہوگئے ہیں۔ سرنامہ نہیں ہے۔ ترقیمہ حسب ذیل ہے:

---

[1] تذکرۂ مخطوطات ادارۂ ادبیاتِ اردو، جلد اول، صفحہ ۱۴۸

[2] رسالۂ اردو ادب بابت جون سنہ ۱۹۵۳ء، صفحہ ۱۴۱



"تمت تمام شد، بست و پنجم ماہ رمضان المبارک روز پنجشنبہ سنہ ۱۲۵۵ ہجری۔ کاتب الحروف فقیر الحقیر میخوار بندہ گنہ گار بہ رحمت امیدوار۔"

مثنوی کا نام کہیں درج نہیں ہے لیکن فہرست نگار نے گنج مخفی لکھا ہے۔[1]

## ۸۔ کتب خانۂ انجمن ترقی اردو، ہند، دہلی

مخطوطہ نمبر (۷۱)، تصوف، تعدادِ صفحات (۱۴) تعدادِ اشعار (۱۴۸)

لوح پر "این آزاد نامہ تصنیف معظم شاہ درج ہے، کوئی ترقیمہ نہیں ہے۔ اس نسخے میں بھی مخطوطہ نمبر (۱۵۰) کتب خانۂ نواب سالار جنگ کی طرح آیات، احادیث اور اقوال کی سرخیاں قائم کر کے شعر لکھے گئے ہیں۔ انجمن کے فہرست نگار نے مثنوی کا نام آزاد نامہ بتایا ہے۔[2]

## ۹۔ کتب خانۂ قادر بادشاہ صاحب، حیدر آباد

تعداد صفحات (۱۶) تعداد اشعار (۱۴۸)

لوح پر "آزاد نامہ" لکھا ہے، کوئی ترقیمہ نہیں ہے۔ یہ نسخہ ایک ضخیم مجموعے میں خانوادۂ امینیہ کے دوسرے بزرگوں کے رسائلِ نظم و نثر کے ساتھ شامل ہے، جن میں سے بعض پر سنہ کتابت سنہ ۱۲۶۰ ہجری درج ہے۔

## ۱۰۔ کتب خانۂ جامعہ نظامیہ، حیدر آباد

تعداد سفحات (۱۶) تعداد اشعار (۱۴۸)

---

[1] رسالۂ اردو ادب، بابت جون سنہ ۱۹۵۳ء، صفحہ ۱۴۱

[2] رسالۂ اردو ادب، بابت جون سنہ ۱۹۵۳ء، صفحہ ۱۴۱

اس نسخے کی لوح پر مثنوی کا نام "آزاد نامہ" درج ہے۔ کوئی ترقیمہ نہیں ہے

۱۱۔ اس مثنوی کا ایک نسخہ کتب خانۂ انجمن ترقیِ اردو، پاکستان، کراچی میں بھی محفوظ ہے۔[1] نام قلندر نامہ ہے۔

ابو نصر خالدی صاحب نے کتب خانۂ نواب سالار جنگ اور کتب خانۂ ادارۂ ادبیات اردو کے نسخوں سے اس مثنوی کا متن مرتب کر کے رسالۂ قدیم اردو (جلد اول) میں شائع کر دیا ہے۔

شاہ معظم کی اس مثنوی کا پتا ہاشمی صاحب مرحوم نے چلایا تھا، چناں چہ وہ لکھتے ہیں:

> اس کی (شاہ معظم کی) دو مثنویوں کا پتا چلا ہے، یعنی شجرۃ الاتقیا اور گنج مخفی۔ ان کو سرسری طور پر ایک کتب فروش کے پاس دیکھا تھا۔[2]

معلوم نہیں ہاشمی مرحوم نے یہ نسخہ کس کتب فروش کے ہاں دیکھا تھا اور یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ اس نسخے کا کیا حشر ہوا۔ چوں کہ ہاشمی مرحوم نے اس نسخے کی تفصیل

---

[1] ۲۲۳، مجموعہ شش رسائل، فہرست مخطوطات، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، جلد اول، صفحہ ۴۰۵۔

[2] دکن میں اردو، چوتھی اشاعت، صفحہ ۲۱۲۔ ہاشمی مرحوم نے نام تو دو ہی مثنویوں کا لیا ہے لیکن جو نمونۂ کلام نقل کیا ہے، اس میں پہلے دو شعر شجرۃ الاتقیا کے ہیں، اس کے بعد کے آٹھ شعر مفتاح الاسرار کے اور آخری تین شعر آزاد نامے کے ہیں۔ ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ ہاشمی مرحوم نے جو بیاض دیکھی تھی اس میں شجرۃ الاتقیا اور آزاد نامے (بقول ہاشمی مرحوم گنج مخفی) کے علاوہ مفتاح الاسرار بھی شامل تھی، لیکن انھوں نے شجرۃ الاتقیا اور مفتاح الاسرار کو ایک ہی مثنوی سمجھ کر شجرۃ الاتقیا کے ابتدائی دو شعر اور مفتاح الاسرار کے درمیانی چار اور خاتمے کے چار شعر نقل کیے ہیں۔



نہیں لکھی ہے، اس لیے اس کا بھی علم نہ ہو سکا کہ اس نسخے پر مثنوی کا نام "گنج مخفی" درج تھا یا خود ہاشمی صاحب نے یہ نام تجویز کیا تھا

۱۹۴۳ء میں ڈاکٹر زور نے اس مثنوی کے ایک ناقص الاول[1] نسخے کو متعارف کراتے ہوئے بتا دیا تھا کہ یہ نسخہ کتب خانۂ ادارۂ ادبیات اردو میں محفوظ ہے۔ چوں کہ یہ نسخہ ناقص الاول ہے اور اس پر رسالے کا نام نہیں ہے، اس لیے قیاس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ہاشمی مرحوم کی تقلید میں اس مثنوی کا نام گنجِ مخفی بتایا ہے۔

حضرت امین کی پیروی میں اُن کے خانوادے کے اکثر بزرگوں نے نظم و نثر کے متعدد رسالے گنج مخفی کے نام سے لکھے ہیں۔ گنجِ مخفی، کنزاً مخفیاً کا ترجمہ ہے۔ اس نام کے رسالوں میں حدیث قدسی کُنْتُ کَنْزاً مَخْفِیاً فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقِ کی وضاحت کرتے ہوئے کائنات کی تخلیق کے مدارج اور ان کے اسرار و رموز کی تشریح کی جاتی ہے۔ یہ خانوادۂ امینیہ کا محبوب ترین موضوع ہے۔ گنج مخفی نام کے رسالوں کے علاوہ دوسرے رسائل میں بھی اس سلسلے کے بزرگ امرِ تخلیق کی یہ بحث کسی نہ کسی عنوان سے چھیڑ دیتے ہیں۔ اس سے ہمارے محققین کو غلط فہمی ہوئی ہے اور انھوں نے اُن رسائل کو بھی جن میں یہ موضوع ضمنی طور پر زیر بحث آیا ہے، گنجِ مخفی کا نام دے دیا ہے۔ زیرِ نظر مثنوی بھی اسی غلط فہمی کا شکار رہی ہے۔ اگرچہ اس مثنوی کے کسی نسخے پر اس کا نام گنجِ مخفی درج نہیں ہے لیکن اس کو گنج مخفی کا نام دیا جاتا رہا ہے۔ اس کے علاوہ ڈیڑھ سو ابیات کی اس مثنوی میں صرف چوتھے شعر سے آٹھویں شعر تک متذکرہ بالا حدیث کا مضمون ضمناً بیان کیا گیا ہے اور بقیہ پوری مثنوی میں اولیا اللہ کی قلندرانہ زندگی اور اُن کے آزادانہ مزاج و مسلک کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے مثنوی کا متن متقاضی ہے کہ

---

[1] تذکرۂ مخطوطات ادارہ ادبیات اردو، جلد اول، صفحہ ۱۴۸

اسس کا عنوان آزاد نامہ ہو اور جن نسخوں پہ مثنوی کا نام درج ہے، آزاد نامہ ہی ہے۔

اس مثنوی کے جتنے نسخے دست یاب ہوے ہیں، اُن میں معظم کا تخلص، ان کے پیر قادر لنگا اور دادا پیر حضرت امین کا نام موجود ہے:

او قادرِ انو کا تو ساقی کتے ؛ پلاتا ہے مئے بھر کے ساقی کتے

مرے پر یو سب راز کھولے امین ؛ حقیقت انو کا یو بولا ہوں میں
معظم نے تب آکے سجدہ کیا ؛ سدا اُن کے نعلین سر پر لیا

اگرچہ مثنوی کے مختلف نسخوں میں اشعار کی تعداد مختلف ہے لیکن صحیح تعداد کا اندازہ خود معظم کے بیان سے ہوجاتا ہے:

امر پر نبی کے یو کھولا ہوں میں ؛ یو سب ڈیڑھ سو بیت بولا ہوں میں

ڈاکٹر زور نے اس مثنوی کے موضوع کے بارے میں لکھا ہے:

"زیرِ نظر مخطوطے میں ان ہی (حضرت امین) کے ایک مرید معظم نے اُن کے ملفوظات اسی طرح جمع کیے ہیں، جس طرح شاہ کمال الدین کے ملفوظات شیخ محمد چشتی نے خوب ترنگ میں اور رحمت اللہ نائب رسول اللہ کے ملفوظات اُن کے مریدِ کامل نے فقر نامے میں منظوم کیے ہیں۔"[1]

ڈاکٹر زور کی یہ رائے درست نہیں ہے۔ شاہ معظم نے اس مثنوی میں حضرت امین کے ملفوظات جمع نہیں کیے ہیں، بلکہ یہ ان کی طبع زاد مثنوی ہے، جو موضوع کی دل کشی اور ہیئت کی چستی کی وجہ سے بیجاپور کے صوفیانہ ادب میں اپنا ایک مقام رکھتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے نہ تو اس کی ہیئت پر غور کیا ہے اور نہ اس کے موضوع اور متن پر توجہ دی ہے بلکہ اِدھر اُدھر سے چند شعر پڑھ کر یہ رائے قائم کرلی

[1] تذکرۂ مخطوطات ادارۂ ادبیات اردو، جلد سوم، صفحہ ۲۸۱



ہے کہ معظم نے اپنے پیر کے ملفوظات جمع کیے ہیں۔ حالاں کہ شاہ معظم نے اس نظم میں فقرا کی سج دھج، وضع قطع، طور طریق، مزاج و افتادِ طبع، بے نیازی و استغنا، مدارج و مقامات، ظاہر و باطن، بے سرو سامانی و طمانیتِ قلب، تعلق باللہ اور توجہ الی اللہ کا ایسے دل کش اور شگفتہ انداز میں ذکر کیا ہے کہ ایک سچے قلندر کی جیتی جاگتی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔

نظم کا آغاز حمد سے ہوتا ہے:

الٰہی تنہیں قادرِ ذو الجلال ؛ توں صاحب جمیلٌ یحبُّ الجمال
سمیعٌ بصیرٌ علیمٌ حکیم ؛ توں خالق، توں رازق، رؤف الرحیم
توں دانا، تو بینا، علام الغیوب ؛ توں مومن، مہیمن، کشاف القلوب

اس مختصر حمد کے بعد سرِ تخلیق کے بارے میں اچٹتے سے اشارے کیے ہیں اور پھر رسولِ اکرم صلعم اور صحابہ کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد نفسِ موضوع کی طرف رجوع کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ خدا نے کسی کو امارت اور شان و شوکت سے سرفراز کیا ہے اور کسی کو فقر و فاقے کی دولت عطا کی ہے۔ کسی کو امیر بنایا ہے اور کسی کو حقیر۔ اس کارخانۂ قدرت کے عجائب و غرائب پر غور کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب اس کی قوتِ تخلیق کا ادنیٰ کرشمہ ہیں، لیکن ان سب میں مرد قلندر کا رنگ ہی نرالا ہے:

ولے بے نوا کا عجب جوگ ہے ؛ عجب جوگ بل بھوگ سنجوگ ہے
چمن میں سو جیوں سرو شمشاد ہیں ؛ فقیروں منے یو نچہ آزاد ہیں
فقیری پہ قائم ہیں او مستقیم ؛ امر جیوں، کیے ہیں نبی الکریم
اللہ کو او دنیا نچہ میں دیکھتے ؛ وو دیکھے ہیں تو ایک کر دیکھتے

اس لیے کہ وہ:

امر ہے خدا کا تو دنیا میں دیکھ ؛ میں پھرتا ہوں اکثر فقیروں کے بھیک

میں پھرتا ہوں عالم میں جیوں ہے تمر ٭ سو جیوں چودویں رات دستا چندر

اور یہ وہ لوگ ہیں جن کی بارگاہِ نبوی میں رسائی ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ اسرار و رموز کے چہرے سے نقاب الٹ سکتے ہیں۔ وہ خلفائے کرام، پنجتن پاک، دوازدہ امام کو مانتے اور ان پر دل و جان سے درود بھیجتے ہیں۔ محی الدین ان کا سچا پیر ہے۔ وہ چشتی بھی ہیں اور قادری بھی، بلکہ ان کی طلبِ حق اُن کو ہر خانوادے سے استفادے پر مجبور کرتی ہے اور وہ ہر ایک سے اکتساب فیض کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ بڑے صاحبِ دل اور صاحبِ قدرت ہوتے ہیں، لیکن ہمیشہ فقر و فاقے اور تنگ دستی اور بے نوائی میں زندگی بسر کرتے ہیں:

دو شہ بانوا سچہ ہیں قدرت منے ٭ دیکھو کیوں او رہتے ہیں غربت منے

سدا فقر و فاقہ تو دن رات ہے ٭ برگ بے نوائی پہ اوقات ہے

اس کے بعد ہی شاہ معظم نے دو عجیب شعر کہے ہیں:

دنیا دین سوں کام دھرتے نہیں ٭ کبھی حق کو بے زار کرتے نہیں

دیکھو حق سو رہتے ہیں کیوں بے نیاز ٭ سدا حق ہے ان سو اہیں با نیاز

سلوک میں ترکِ مولیٰ کی بھی ایک منزل ضرور آتی ہے لیکن یہاں اس منزل کا ذکر بھی نہیں معلوم ہوتا۔ ممکن ہے شاہ معظم کے ذہن میں عشقِ حقیقی کا وہ مقام ہو جہاں طالب خود مطلوب اور محبوب بن جاتا ہے۔ اسی مقام پر فائز ہونے کی وجہ سے سیدنا عبد القادر جیلانیؒ کو محبوبِ سبحانی اور معشوقِ ربانی یا سید احمد رفاعیؒ کو معشوق اللہ کہا جاتا ہے، لیکن یہ اندازِ بیان کہ "حق کوں بے زار کرتے نہیں"، یا "دیکھو حق سو رہتے ہیں کیوں بے نیاز"۔ اس مفہوم کی بھی معاونت نہیں کرتا۔ خاص کر اس لیے بھی کہ وہ اگلے اشعار میں جو بات کہتے ہیں وہ ان اشعار سے میل نہیں کھاتی:

مُربّی کی خدمت فرض جانتے ٭ مُربّی کو معبود کر مانتے

نفی کر اپس کو مُربّی منے ٭ مُربّی کو دیکھے ہیں ربّی کنے



مربّی سے مراد شیخ ہے۔ شیخ سے یہ نیاز مندی اور خدا سے بے نیازی، شیخ میں یہ فنائیت اور ذاتِ باری سے بے تعلقی، سمجھ میں نہیں آتی

بہر حال ان الجھے ہوئے اشعار کے بعد وہ مربوط اور مسلسل انداز میں اولیا اللہ کے حالات و واقعات کا ذکر بڑے پُرجوش اور والہانہ انداز میں کرتے ہیں:

حضوری سوں غائب او ہوتے نہیں ٭ عبث دم او نا چیز کھوتے نہیں

ہر ایک شئے منے ایک کو دیکھتے ٭ اوسی ایک میں سب کو او لیکھتے

نفی کر اپس کو مربّی منے ٭ مربّی کو دیکھے ہیں ربّی کنے

اگر کوئی (جو) ہوتا ہے فانی فی اللہ ٭ وہ رہتا ہے حق ہو کے باقی باللہ

عبادت او باطن میں کرتے مدام ٭ سدا صوم باطن میں دھرتے مدام

زباں سوں تو وہ ذکرِ جلّی کریں ٭ او دل میں سدا اپنے قلبی دھریں

کریں ذکرِ روحی او ات شوق سوں ٭ او رہتے ہیں سرّی منے ذوق سوں

خفی حال دائم ہے ان پر مدام ٭ فقیری دسے نت اونو پر تمام

شریعت تو ان کا دیکھو قال ہے ٭ طریقت انو کا تو افعال ہے

حقیقت ہے احوال ان پر مدام ٭ دیکھو معرفت سب کھولیا ہے تمام

اس کے بعد مختلف عوالم، ناسوت، ملکوت، لاہوت، ہاہوت، میں اولیا اللہ کی سیر کا ذکر کیا ہے۔ عالم ہاہوت کا نام لیے بغیر بڑے لطیف انداز میں کہتے ہیں کہ

انو کا وہاں لگ تو سر حدا ہے ٭ جہاں باجتا گھاٹ[1] ان حدا ہے

یہی وہ لوگ ہیں جو سفر در وطن کرتے ہیں

سفر دیکھ ظاہر تو بیٹھے ہیں او ٭ ولے سیر باطن میں کرتے ہیں او

---

[1] (ن) گھانٹ، گھنٹہ۔ انہد ناد۔ صوتِ سرمدی۔

اسی طرح وہ باطن میں روزہ نماز ادا کرتے ہیں:

ادکرتے ہیں باطن میں روزہ نماز ❊ کھولا (دکھلا) ہے اُنوں پر تو راز و نیاز

خانوادۂ امینیہ میں ہر فرض کا ایک باطن بیان کیا گیا ہے۔ شاہ معظم کی مراد یہاں اسی باطن سے ہے، لیکن جو اندازِ بیان اختیار کیا گیا ہے اس سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ یہ اولیا اللہ ظاہر میں روزہ نماز ادا نہیں کرتے لیکن باطن میں وہ یہ تمام فرائض انجام دیتے ہیں۔ ہمارے اس قیاس کی تائید اگلے شعر سے بھی ہوتی ہے:

بجز ان کو رویت تو کچھ کام نیں ❊ بجز حق کو دیکھے کے آرام نیں

رویت حق کے انھیں طلب گاروں میں اقطاب، اولیا، اور اتقیا ہوتے ہیں۔

وہ چار تن[1] کے شہید ہوتے ہیں، یعنی وجود کے چاروں مدارج میں انھیں فنائیت نصیب ہوتی ہے۔ وہ سات[2] مستیوں کی نفی کرتے ہیں اور صرف بقا کی مستی میں مگن رہتے ہیں، تن کے پانچ موذیوں[3] کو قتل کرکے ان سے نجات حاصل کر لیتے ہیں۔

---

[1] خالدی صاحب نے چار تنوں کے نام حقیقی، خارجی، ذہنی اور اسمی بتائے ہیں۔ (قدیم اردو، جلد اول، صفحہ ۲۷۰) لیکن خانوادۂ امینیہ کی اصطلاح میں یہ واجب الوجود، ممکن الوجود، ممتنع الوجود، اور عارف الوجود ہیں۔

[2] خالدی صاحب نے بتایا ہے کہ یہ سات مستیاں، جوانی، حسن، حکومت، دولت، شراب، علم و قوت ہیں، لیکن حضرت امین اور ان کے خانوادے کے بزرگ ان کی تفصیل یوں بیان کرتے ہیں۔ پہلی مستی نسب کی، دوسری مستی وسیلے کی، تیسری مستی حسن کی، چوتھی مستی ہنرمندی کی، پانچویں مستی علم ظاہر کی، چھٹی مستی مال و دولت کی، اور ساتویں مستی بادشاہی کی۔ یہ ساتوں مستیاں فانی ہیں، آٹھویں مستی یاد الٰہی کی ہے، اس مستی کو بقا ہے۔

[3] خالدی صاحب نے پانچ موذیوں سے کبر، کینہ، غیبت، بغض اور حسد مراد لی ہے، لیکن یہ دراصل آنکھ، ناک، منہ، کان، زبان اور عضو تناسل، (لمس) یعنی حواس خمسہ کے صفات ذمیمہ ہیں۔ خالدی صاحب نے غفلتوں کی تشریح نہیں کی ہے۔



چھے غفلتوں پر قابو پا لیتے ہیں اور پانچ جوہروں[1] کی حفاظت کرتے ہیں:

نفی سات مستیاں کی کرتے ہیں او ❊ بقا ایک مستی سوں رہتے ہیں او

سدا چار تن او ہو کر شہید ❊ کتے حق سوں پاتے ہیں خلعت جدید

موذی پانچ رہتے ہیں تن میں گبل ❊ اول ان کو کرنا کتے ہیں قتل

پچھیں شش جہت سوں نکلتے ہیں بھار ❊ شہادت کے دریا سوں ہوتے ہیں پار

کتے چھ سچ غفلت ہیں انسان میں ❊ حذر او چہ دیتے ہیں ایمان میں

او سے دور کرتے سو چو سار ہیں ❊ او سے دور کرتے سوائے یار ہیں

اَمارے کو دل میں سوں کرتے ہیں دور ❊ ہوا خمس کو مار کرتے ہیں چور

جواہر کتے پانچہ ہیں بے بدل ❊ جتن خوب رکھتے ہیں ان کو اول

بڑے مرد بارے یو آزاد ہیں ❊ دیکھو سب سوں نیارے یو آزاد ہیں

یہ مردِ آزاد بقا کی مستی میں ایسے سرشار رہتے ہیں کہ انھیں زندگی کی کسی قید و بند کی پروا نہیں رہتی۔ وہ ہمیشہ مفلس اور قلاّش رہتے ہیں، لیکن اپنا حال کسی پر ظاہر نہیں کرتے۔ وہ محتاج الیہ صرف خدا کی ذات کو سمجھتے ہیں، اس لیے ساری مخلوق سے استغنا برتتے ہیں۔ اس بھری دنیا کے غل و غش میں زندگی گزار دیتے ہیں، لیکن اس سارے ہنگامے سے بے خبر اور بے نیاز رہتے ہیں۔ اسی حالت اور اسی کیفیت کو اہلِ چشت خلوت در انجمن کہتے ہیں۔

جریدے مجرد ہو رہتے ہیں دیکھ ❊ ہو غل غش سو فارغ مفرد ہیں دیکھ

یہ لوگ کسب معیشت کے لیے نہ دین کو ذریعہ بناتے ہیں اور نہ دنیا کو، نہ وہ کسی کے لیے چلّے کھینچتے ہیں اور نہ نقش و تعویذ لکھتے ہیں۔ نہ مالا جپتے ہیں اور نہ تسبیح

---

[1] خالدی صاحب نے پانچ جوہر صوری، طبعی، عقلی، مادی اور نفسانی بتائے ہیں، لیکن ان سے مراد دراصل ایمان، شرم، عقل، عبادت، (عمل) اور صبر ہیں۔

پھیرتے ہیں، انھیں کیمیا کی خواہش ہے اور نہ سیمیا کی آرزو، وہ طبابت سے دلچسپی لیتے ہیں اور نہ زراعت سے، بجز بھیک، ان کا کوئی حیلۂ معاش نہیں

معظم غالباً یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اولیا اللہ کسب معاش کے بکھیڑوں میں نہیں پڑتے۔ بندگانِ خدا ان کی خدمت کر دیتے ہیں۔ بس اسی پر ان کی گزر بسر ہوتی ہے۔ بھیک کا لفظ بھی غالباً انھوں نے توکّل کے مفہوم میں استعمال کیا ہے، لیکن فقرا کی بے نیازی اور استغنا کا جو تیکھا نقش اُبھارا گیا ہے، اِس ایک لفظ سے اُس پر پانی پھر جاتا ہے۔

بہرحال شاہ معظم اولیا اللہ کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ اس دنیا کی کھیتی کی فکر کرنے کی بجائے عاقبت کی کھیتی کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ وہ صرف و نحو جیسے علومِ ظاہری سے بے بہرہ ہیں مگر مَنْ عَرَفَ کے ورس میں مگن رہتے ہیں۔

نہ چلہ دھریں اونہ نقشاں بھریں ٭ نہ مالا جپیں اونہ تسبیح کریں
نہ کرتے کدیں (دیکھ) او کیمیا ٭ نہ لیتے کدیں نام او سیمیا
نہ دارو کریں کس کی ہوکر حکیم ٭ سمجھتے ہیں حق کو غفور الرّحیم
نہ کھیتی کریں اونہ سیچیں ملا ٭ بجز بھیک دیگر نہیں کچھ حیلا
زراعت کریں مزرعہ الآخرہ ٭ تجارت کریں ملّت الباہرہ
نہ او علم پڑتے نحو صرف کا ٭ سدا درس لیتے ہیں مَن عَرَف کا
او تعویذ طومار کرتے نہیں ٭ کرامت دیکھا پیٹ بھرتے نہیں

شاہ معظم نے اب تک جو تفصیل بیان کی ہے وہ شریعت سے متناقض نہیں ہوتی لیکن اگلا بیان محلِ نظر ہے،

ترک کر کے سب کفر اسلام کو ٭ رکھے ہیں مربّی کے یک نام کو
نہ مہدی، نہ سنّی، نہ او خارجی ٭ نہ دہری، نہ یزدی، نہ او رافضی
فقیری دیکھو (ان پہ) کیا بار ہے ٭ یو رندی انو پو سزاوار ہے



یعنی، ان پر فقیر سے زیادہ رند کا لفظ صادق آتا ہے، اور:

نبی نے کہے ان کو مذہب نہیں ٭ یو صوفی ہیں، مذہب سو مطلب نہیں
او ظاہر تو ہیں رندِ خلد نماں ٭ ولیکن ہے باطن میں امن و اماں
یو ظاہر لیے بھیک بھگوان کا ٭ ولے کھیل باطن میں سبحان کا
مقرب سدا حق سوں رہتے ہیں او ٭ وہی حال اور قال رکھتے ہیں او

یہ صحیح ہے کہ جو فقرا مغلوب الحال ہوتے ہیں وہ تکلیفِ شرعی کے بجا لانے سے معذور رہتے ہیں، لیکن یہاں شاہ معظم کا اشارہ صوفیہ کی مغلوبیت کی طرف نہیں معلوم ہوتا، بلکہ وہ صاف الفاظ میں یہ کہہ رہے ہیں کہ صوفیہ اوامر و نواہی کی پابندی سے آزاد ہوتے ہیں اور اپنے بیان کی تائید میں ایک موضوع حدیث سے استدلال بھی کرتے ہیں کہ صوفیہ کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ اس سے زیادہ دلچسپ بات وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ فقرا بہ ظاہر بھگوان کے بھیس میں نظر آتے ہیں، لیکن یہ سب بہ باطن سبحان کا کھیل ہے۔ معظم غالباً یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ان کا ظاہر غیر مسلموں کا سا ہے لیکن باطن مسلمان ہے۔ آزاد مشرب فقرا کی اس دلچسپ صفت کے بیان سے ہم یہ قیاس کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ شاہ معظم کے ذہن میں اپنے شیخ قادر لنگا کوتال کی تصویر ہے، جن کے بارے میں تذکرہ نگار کہتے ہیں کہ وہ اپنے پانو میں لنگ باندھتے تھے، ممکن ہے کہ وضع قطع بھی لنگایتوں کی سی بنا رکھی ہو۔ معظم اپنے شیخ سے والہانہ محبت کرتے تھے، ان کی شاید ہی کوئی نظم اور غزل ہوگی، جس میں انھوں نے اپنے شیخ کا ذکر نہ کیا ہو۔ اس لیے خیال ہوتا ہے کہ اس مثنوی میں جس مردِ آزاد کی پرچھائیاں ملتی ہیں، اور جس کے ذکر سے معظم کی گرمیِ گفتار قائم ہے، وہ قادر لنگا ہی ہوں گے۔

شاہِ معظم نے عمومی انداز میں فقرا کو جن صفات سے متصف کیا ہے، اس سے ہم اختلاف کر سکتے ہیں، لیکن ان کے معہودِ ذہنی کی پیشِ نظر رکھا جائے تو اس اختلاف

کی اہمیت بہت کم ہوجاتی ہے۔ اس لیے کہ معظم کے دل ودماغ پر جس فقیرِ کامل کا تصور چھایا ہوا ہے وہ اسی کو مثالی فقیر سمجھنے میں حق بہ جانب ہیں۔ اس لیے اگر وہ اپنے اس مثالی فقیر کے حال اور حلیے کو تمام فقرا پر منطبق کرتے ہیں تو یہ عین تقاضائے عشق ہے۔ فنافی الشیخ سے اس کے علاوہ اور کیا توقع کی جاسکتی ہے۔

ہمارے اس خیال کی تصدیق مثنوی کے آخری حصے کے ایک شعر سے بھی ہوتی ہے جس میں معظم صاف صاف کہتے ہیں :

او قادر انوں کا تو ساقی کتے ٭ پلاتا ہے مئے بھر کے باقی کتے

یعنی قادر لنگا ان فقرا کے سرگروہ ہیں اور وہی ان کو معرفت کی شراب پلاتے ہیں۔

فقرا کی اس آنبادہ روی کے سلسلے میں معظم کہتے ہیں :

دنیا کے ہیں طالب مخنث کتے ٭ ہیں جنت کے طالب مونث کتے
جو طالب خدا کے سو او مرد ہیں ٭ جکوئی مرد ہیں او چہ پر درد ہیں
یہی لوگ ہادی ہیں رہبر کتے ٭ انو کو رچ نر ہور مذکر کتے

جب شیخ ان فقرا پر میں پن کا راز منکشف کردیتا ہے تو وہ فضائے معرفت میں شہ باز بن کر پرواز کرنے لگتے ہیں۔ یہ فقرا معرفت کے مقاماتِ جلیلہ پر فائز ہوتے ہیں، لیکن ہمیشہ اپنے علوے مرتبت کو چھپائے رکھتے ہیں :

او محیط کتے کون، او مطلق ہے کون ٭ او بندہ کتے کون، ہور حق ہے کون
مرے میں یو میں میں کتا کون ہے ٭ مرے میں خدا ہو رہتا کون ہے
یو مرشد سوں سنتے ہیں جب راز او ٭ تو دستے ہیں عالم میں شہ باز او
او زاہد ہیں عارف ہیں عاشق کتے ٭ او واصل ہیں دستورِ سابق کتے
ولیکن اپس کو چھپاتے ہیں او ٭ دیکھو توجہ عالم کو بھاتے ہیں او

ان کی وضع قطع، ان کے طور طریق اور ان کے اطوار کا حال یہ ہے :



سر و پا برہنے او پھرتے ہیں دیکھ ٭ دیکھو گیند کر سر کو دھرتے ہیں دیکھ
دیکھو سر گذشتہ ہیں کیا بے ریا ٭ نہیں کچھ اونو میں دیکھو رو ریا
(سرگشتہ)
او جنت سوں کچھ کام دھرتے نہیں ٭ جہنم سوں کچھ باک دھرتے نہیں
اگاڑی پچھاڑی او رہتے نہیں ٭ نچی ہور اونچی کس کی سہتے نہیں
بزرگی کو اپنی رکھے عرش پر ٭ دیکھو بھیک منگتے ہیں کیوں در بہ در
سدا اپنے باطن میں کرتے سجود ٭ ہمیشہ وہ کرتے تلاوت وجود
دعا بد دعا کس کو دیتے نہیں ٭ وہ پونجی ٹکا کس سے لیتے نہیں
اسم بامسما ہے ان پر گدا ٭ دیکھو کیوں وہ رہتے ہیں مفلس سدا
نفی ذات میں ہو کے اثبات ہیں ٭ او آزاد ہیں اور الٰہ ذات ہیں

خانوادۂ امینیہ میں سب سے افضل عبادت تلاوتِ وجود یعنی اپنے تن کا عرفان ہے۔ تن کے عرفان ہی سے حق کا عرفان ہوتا ہے۔ شاہ معظم بھی اسی عرفان و آگہی پر زور دیتے ہیں :

سدا اپنے باطن میں کرتے سجود ٭ ہمیشہ وہ کرتے تلاوت وجود
اول اپنے تن کی وہ کرتے شناس ٭ کتے توجہ ہوتے ہیں او حق شناس

تلاوتِ وجود کے بعد وہ مرد آزاد کی حضوریِ قرب اور فنائیت کا ذکر کرتے ہوئے فقر کے اعلیٰ ترین مرتبے کی وضاحت کرتے ہیں :

امر ہے تمھیں حق سے یاری کرو ٭ حضوری نپٹ جاں نثاری کرو
اوسی وضع یاری یو کرتے ہیں یار ٭ سدا یار پر دیکھ ہوتے نثار
ملاتے ہیں او نور کو نور میں ٭ ندی جوں کے ملتی ہے سمدور میں
خدا سات ہل مل کے ہوتے ہیں ایک ٭ او سی کا دیکھو او چہ لیتے ہیں بھیک
خدا سات ملنے کو یک وقت ہے ٭ نبی نے کہے وقت او سخت ہے

نہ واں کچھ وساطت نہ کس کا گزر ؛ ملائک مقرب نہ مرسل دگر
سدا دھاں انو کا کتے سبر ہے ؛ سدا دھاں انو کا دیکھو طیر ہے
وہاں جا کے میں توں سوں جاتے گزر ؛ بجز حق کتے واں نہیں کچھ گزر
خدا باج واں کوئی بستا نہیں ؛ خدا باج واں کوئی دِستا نہیں
عجائب یو منزل ہے لاہوت کا ؛ وہاں غلغلہ سب ہے ہاہوت کا

یو مردانِ حق کچھ خدا تو نہیں ؛ ولیکن خدا سے جدا بھی نہیں
سدا عیش کرتے ہیں مل یار سوں ؛ سدا اِل کے رہتے ہیں دل دار سوں

فقیری عنایت ہدایت سوں ہے ؛ عطا سب کو شاہِ ولایت سوں ہے
فقیری عنایت نبی پر کیا ؛ یہی دلق معراج میں حق دیا

شاہ معظم مثنوی کے آخری حصے میں قاری کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ اے سالک، وجود کے چار مدارج طے کیے بغیر معرفتِ تامہ نصیب نہیں ہوتی اور جو سالک یہ منازل طے کر لیتا ہے وہی دراصل نبی کا فرزند یعنی محبوب ہے:

وجود چار یو تجھ پو جامے ہیں چار ؛ وجود سوں جدا کر آپس دیکھ بھار
یہی چار منزل عجب راہ راس ؛ اسی رہ سوں آتے ہیں سب چل کے خاص
کتے ہیں نبی کا او فرزند ہے ؛ جو یوں چل کے آتا سو دل بند ہے
اسی رہ سو آکے ہوے ہیں وہ پیر ؛ اسی رہ سوں چلتے ہیں سارے فقیر
تو سب کشف دِستا ہے ان پر مدام ؛ علیک الصلوٰۃ وعلیک السلام

آخر میں وہ اپنے پیر قادر لنگا کا ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ میں نے امرِ رسول کی متابعت میں یہ ڈیڑھ سو شعر کہے ہیں اور ان اسرار و رموز کو بیان کیا ہے جن کا انکشاف مجھ پر



حضرت امین نے فرمایا ہے۔

میراں جی شمس العشاق، برہان الدین جانم، امین الدین علی اعلیٰ اور ان کے خلفا نے نظم و نثر کا جو سرمایہ چھوڑا ہے وہ دین کے مسائل بالخصوص تصوف کے مباحث کی تشریح و تفہیم کی ان تھک مساعی کا نتیجہ ہے۔ معظم کا تعلق بھی اسی خانوادے سے ہے، اور وہ بھی اسی خانوادے کی تعلیمات کو نظم کرتے ہیں، لیکن معظم صرف مبلغ اور صوفی نہیں قادر الکلام شاعر بھی ہیں۔ انھوں نے تصوف کے موضوعات پر مثنویاں ہی نہیں لکھی ہیں بلکہ غزل کا ایک ضخیم دیوان بھی یادگار چھوڑا ہے۔ وہ حقیقت کے رمز آشنا ہی نہیں غالباً مجاز کے تیرِ ستم کے گھایل بھی تھے اور یہ وہ خصوصیات ہیں جو ان کو اپنے خانوادے کے دوسرے شاعروں سے ممتاز کرتی ہیں۔

زیرِ نظر مثنوی میں انھوں نے صوفیہ کے حال و قال، ظاہر و باطن، وضع قطع اور طور طریق بیان کیے ہیں اور ضمناً مختلف مسائل بھی چھیڑ دیے ہیں، لیکن زورِ بیان کا یہ عالم ہے کہ نظم ٹھاٹھیں مارتا سمندر معلوم ہوتی ہے اور روانی کی یہ کیفیت ہے کہ مثنوی شروع کرنے کے بعد ختم کرنے تک ہاتھ سے نہیں چھوٹتی۔ اگرچہ اس مثنوی میں کوئی خاص ادبیت نہیں ہے لیکن جس کو گیارھویں صدی کی صوفیانہ شاعری کے مطالعے کا موقع ملا ہے وہ اندازہ کر سکتا ہے کہ معظم کو زبان و بیان پر کتنی قدرت تھی اور ان کے ہاں مذہبی اور خشک موضوعات کے بیان میں بھی کیسی چستی، شگفتگی، بے ساختگی اور دل آویزی پائی جاتی ہے۔

اس مثنوی کی ایک دل چسپ خصوصیت یہ ہے کہ اس میں متعدد شعر ایسے ملتے ہیں جن میں حروف، ربط اور افعال کی قدیم شکلوں کو بدل دیا جائے تو ان کی زبان آج کی زبان معلوم ہوگی:

دنیا دین سوں کام دھرتے نہیں ؛ کبھی حق کوں بے زار کرتے نہیں
سدا عیش کرتے ہیں مل یار سوں ؛ سدا اِل کے رہتے ہیں دل دار سوں

حضوری سوں غائب او ہوتے نہیں ٭ عبث دم او ناچیز کھوتے نہیں
بزرگی کوں اپنی رکھے عرش پر ٭ دیکھو بھیک منگتے ہیں کیوں در بہ در
ہراک شَے منے ایک کو دیکھتے ٭ اسی ایک میں سب کو او لیکھتے

اس سے زیادہ دل چسپ بات یہ ہے کہ بعض شعرا ایسے بھی مل جاتے ہیں، جن کی زبان بالکل آج کی زبان ہے :

یہ مردانِ حق کچھ خدا تو نہیں ٭ ولیکن خدا سے جدا بھی نہیں
ہمیشہ وہ قلاش مفلس رہیں ٭ نہ وہ حال اپنا کسی سے کہیں
نہ وہ علم پڑھتے نحو صرف کا ٭ سدا درس لیتے ہیں مَنْ عَرَفَ کا

زبان کی اس تراش خراش کی وجہ سوائے اس کے کچھ سمجھ میں نہیں آتی کہ قادر الکلام شعرا کا وہ ذوق جو الفاظ اور جملوں کے انفرادی اور اجتماعی آہنگ کا ادراک کرتا ہے، ایسی سلیس و سبک زبان لکھنے کی طرف غیر شعوری طور پر ان کی رہنمائی کرتا ہے۔





# گلزارِ چشت

کتب خانۂ نواب سالار جنگ، مخطوطہ نمبر (۱۳۱) تصوّف۔

یہ مخطوطہ شاہ معظم کی دو مثنویوں، شجرۃ الاتقیا اور گلزارِ چشت پر مشتمل ہے۔ اس طرح کہ پہلے شجرۃ الاتقیا ہے: اِس کے خاتمے پر دوسرے صفحے سے بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم لکھ کر رسالۂ گلزارِ چشت شروع کیا گیا ہے۔ دونوں مثنویوں کی لوح پر ان کے نام درج نہیں ہیں، لیکن شاہ معظم نے شجرۃ الاتقیا کے ابتدائی حصے میں اور گلزارِ چشت کے آخری ابیات میں رسالوں کے نام دے دیے ہیں :

ہوا مجھ امر خاتم الانبیا ٭ اسے نام رکھ شجرۃ الاتقیا
مبارک رکھا نام گلزارِ چشت ٭ پڑھے یا سنے سو وہ پاوے بہشت

شاہ معظم نے گلزارِ چشت کے اشعار کی تعداد چار سو بتائی ہے :

یو سب چار سو دیکھ ابیات ہے ٭ شہد سو مٹھی تر ہر یک بات ہے

لیکن زیرِ نظر نسخے میں صرف (۳۰۷) ابیات ہیں۔ یہ نسخہ (۳۱) صفحات پر مشتمل ہے

ترقیمہ : تمت تمام شد تحریر فی التاریخ نہم ماہ ربیع الآخر، روز جمع (جمعہ) وقت دو پہار انصرام رسید از خط خام سید جعفر باشیبان

شجرۃ الاتقیا اور گلزارِ چشت دونوں مثنویوں کی نوعیت منظوم تذکروں کی ہے۔ اول الذکر مثنوی میں حضرت خواجہ بندہ نواز سے علی پیر تک بندہ نوازی سلسلے کی

بیجاپوری شاخ کے تمام بزرگوں کا ذکر ہے اور موخر الذکر میں حضرت خواجۂ اجمیری سے حضرت برہان الدین غریب اور ان کے خلفا تک تمام سر برآوردہ شیوخِ سلسلہ کا حال قلم بند کیا ہے۔ ان دونوں تذکروں کے مطالعے کے بعد جو خیال معاً ذہن میں آتا ہے وہ یہ کہ گلزارِ چشت کو پہلے اور شجرۃ الاتقیا کو بعد میں نقل ہونا چاہیے تھا، بلکہ شجرۃ الاتقیا کو ایک علاحدہ رسالے کی صورت دینے کی بجائے گلزارِ چشت ہی کے سلسلے میں لکھا جانا چاہیے تھا، لیکن دونوں رسالوں کی علاحدہ اور مستقل حیثیت صاف بتاتی ہے کہ یہ تقدیم و تاخیر کاتب کی نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں شاہ معظم کے پیشِ نظر صرف خانوادۂ میراں جی شمس العشاق کا تذکرہ قلم بند کرنا تھا۔ اس لیے انھوں نے اس خانوادے کے سرچشمۂ فیض حضرت بندہ نواز گیسو دراز سے شجرۃ الاتقیا کا آغاز کیا اور حضرت جمال الدین مغربی، حضرت کمال الدین بیابانی، حضرت شمس العشاق، حضرت شاہ برہان الدین جانم، حضرت امین الدین علی اعلیٰ، حضرت بابا شاہ حسینی، اور حضرت علی پیر کے حالات و کمالات کو بیان کر کے نظم کو ختم کر دیا۔ غالباً اس نظم کی تکمیل کے بعد انھیں احساس ہوا کہ اس سلسلے کی ابتدائی کڑیوں کو بھی جوڑنا چاہیے۔ چناں چہ انھوں نے گلزارِ چشت لکھی اور اس میں حضرت خواجۂ اجمیری سے حضرت برہان الدین غریب نواز تک، اس سلسلے کے بزرگوں کا حال قلم بند کیا۔ زمانۂ تصنیف کے اسی تقدم و تاخر کی وجہ سے زیرِ نظر مخطوطے میں پہلے شجرۃ الاتقیا ہے اور اس کے بعد گلزارِ چشت نقل کی گئی ہے۔ اس قیاس کی تائید حسب ذیل امور سے بھی ہوتی ہے:

(۱) شجرۃ الاتقیا میں حمد، نعت، واقعۂ معراج کا ذکر اور صحابہ کی منقبت جس تفصیل کے ساتھ لکھی گئی ہے، وہ گلزارِ چشت میں نہیں ملتی بلکہ ان موضوعات پر صرف چند شعر ہیں؛

(۲) شجرۃ الاتقیا میں بزرگانِ سلسلہ کے حالات و کمالات جس تفصیل، خلوص اور والہانہ پن کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں، گلزارِ چشت میں نہ تو وہ تفصیل ہے اور نہ وہ



جوشِ بیان۔

(۳) شجرۃ الاتقیا، میں سببِ تصنیف کے سلسلے میں لکھا ہے کہ وہ یہ رسالہ رسولِ اکرمؐ کے حکم کی تعمیل میں لکھ رہے ہیں، گلزارِ چشت میں ایسا کوئی سبب نہیں بیان کیا ہے، البتہ مثنوی کے آخری حصے میں اپنے پیر حضرت امین کی مدح کے سلسلے میں لکھا ہے کہ انھیں کی برکت سے یہ تمام رموز مجھ پر آشکار ہوئے ہیں اور انھیں کے امر سے میں نے یہ اسرار و رموز بیان کیے ہیں:

ہوا راز مکشوف سب آشکار ؛ تسلا ہوا دل نے پایا قرار
امر پیر کا تھا سو بولا ہوں میں ؛ چھپے راز تب لا کے کھولا ہوں میں
یو سب چار سو دیکھ ابیات ہے ؛ شہد سو مٹھی تر ہر یک بات ہے
مبارک رکھا نام گلزارِ چشت ؛ پڑھے یا سُنے سو وہ پاوے بہشت

ظاہر ہے کہ سلوک و معرفت کے اسرار کی تشریح و تفہیم کا حکم، کوئی خصوصی حکم نہیں ہے، بلکہ ہر شیخ اسی فریضے کے انجام دہی کی تاکید و تلقین کرتا ہے، اس لیے ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہیں کہ متذکرہ صدر اشعار سے یہ مترشح نہیں ہوتا کہ رسالۂ گلزارِ چشت شاہ معظم نے پیر کے حکم پر لکھا ہے۔

اس تشریح سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ شاہ معظم نے خود اُن کے بیان کے مطابق رسولِ اکرمؐ کی ایما پر شجرۃ الاتقیا لکھی۔ مثنوی کا یہ نام بھی حضور اکرمؐ کا دیا ہوا ہے۔ اس مثنوی کی تصنیف کے بعد اوپر کے سلسلے کی تکمیل کی غرض سے انھوں نے گلزارِ چشت قلم بند کی۔ شجرۃ الاتقیا میں حضرت علی پیر کے حالات و کمالات کا تذکرہ بھی ہے، جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ رسالہ بارھویں صدی کے تیسرے دہے میں لکھا گیا۔ گلزارِ چشت چوں کہ شجرۃ الاتقیا کے بعد لکھی گئی ہے، اس لیے اس کا زمانۂ تصنیف بھی یہی ہوگا۔

گلزارِ چشت کا آغاز حسبِ ذیل اشعار سے ہوتا ہے:

الٰہی تو عالم علام الغیوب ٭ تو مومن، مہیمن، کشاف القلوب
سدا حی و قیوم، قادر ہے تو ٭ ہر وقت حاضر سو ناظر ہے تو
تو دانا، تو بینا ہے صاحب کریم ٭ توں خالق، تو رازق، رؤف الرحیم
توں حاکم ہے حکمت میں روشن ضمیر ٭ ہریک ایک حکمت تیرا بے نظیر
فلک کا مندف خوب چھایا ہے تو ٭ سورج چاند قندیل لایا ہے تو
سورج (سوں) دیکھو روز روشن کیا ٭ رین سوں ستاروں کو گلشن کیا
دیا دھرت کو دھیر پانی اوپر ٭ دیکھو عام سفرا بچھا تس اوپر

حمد کے بعد مرتبۂ گنجِ مخفی سے ذاتِ احد کے نزول کو بیان کرتے ہوئے حقیقتِ محمدی کی اس طرح وضاحت کی ہے:

احد تھا سو بر حق وہ احمد ہوا ٭ وہی دیکھ احمد محمدؐ ہوا
ازل سوں اول حق نبی کو کیا ٭ دیکھو تب نبی کو خلافت دیا
اپے آپنا ذوق لینے بدل ٭ اپے خود وو آیا ہے باہر نکل

اس کے بعد نعت میں چند شعر کہے ہیں اور اسی سلسلے میں واقعۂ معراج کو بھی بیان کیا ہے۔ خلفا کی منقبت صرف ایک ایک شعر میں کی ہے۔ شجرۃ الاتقیا میں چاروں صحابہ کی منقبت تفصیل سے کی ہے۔ حضرت علی کی مدح صحابہ کے ساتھ بھی کی ہے اور علاحدہ بھی۔ دوسری دفعہ جو مدح کی ہے، وہ نہ صرف تفصیلی ہے بلکہ یہاں شاہ معظم نے بڑا زورِ قلم صرف کیا ہے۔ اس کے برخلاف گلزارِ چشت میں دوسرے صحابہ کے ساتھ ایک شعر پر اکتفا کیا ہے:

چوتھے... علی شاہ دلدل سوار ٭ کہتے ہیں جسے صاحبِ ذوالفقار

شجرۃ الاتقیا میں شاہ معظم نے لکھا ہے کہ خدا نے نبی کو اپنا نائب بنایا اور نبی نے



علی کو اور علی نے ہر ملک میں اولیا کو اپنا نائب مقرر کیا۔ یہی بات زیرِ نظر رسالے میں بھی کم و بیش انھیں الفاظ میں دہرائی ہے۔ چناں چہ حضرت علی کی مدح کے بعد نہایت اختصار کے ساتھ کہتے ہیں:

نبی پر کرم کر نبوت دیا ٭ علی کے حوالے ولایت کیا
علی کے ہیں نائب ہر اک شہر میں ٭ ہر اک ملک میں ہور ہر اک دہر میں
ہریک (ملک) میں دیک اصحاب ہیں ٭ ہریک دہر میں قطبِ اقطاب ہیں
علی نے مُلک سب ولیاں کو دیے ٭ ہریک مُلک کو ایک والی کیے

غرض شاہ معظم نے حمد، نعت، منقبت اور تمہید سب کچھ (۳۷) ابیات میں ختم کر دی ہے، اور اس کے بعد حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا ذکر شروع کیا ہے:

دیے ملک خواجہ کو یہ ہند کا ٭ جتا ہند کا اور جتا سند کا[1]
کتے تو چ ہند الولی شاہ کو ٭ عطا ہے لقب شہ کو درگاہ سو
دیا تخت حق شہ کو اجمیر کا ٭ ہے جس کے نیچے ملک سیمیر کا

معظم کہتے ہیں کہ اجمیر پر پرتھوی راج کی حکومت تھی۔ اس کا بڑا بھائی اجے پال[2] بہت بڑا ساحر تھا۔ اجے پال نے حضرت خواجہ پر سحر و طلسم کے کئی وار کیے، لیکن

---

[1] تذکروں کا بیان ہے کہ حضرت عثمان ہارونی سے خلافت و اجازت حاصل کرنے کے بعد حضرت خواجہ معین الدینؒ ہارون سے مدینۂ منورہ روانہ ہوئے اور بارگاہِ نبوی پر حاضری دی۔ اس موقعے پر رسول اکرمؐ نے بشارت دی کہ "خدا نے ہندستان کا ملک تیرے سپرد کیا ہے"۔

[2] تذکرہ نگاروں نے اس کا نام جے پال جوگی لکھا ہے۔ وہ راے پتھورا کا گرو اور بہت بڑا ساحر تھا۔ راے کے حکم سے اس نے اپنے ڈیڑھ ہزار چیلوں کے ساتھ حضرت کو تنگ کرنا شروع کیا۔ لیکن اس کے سحر و طلسم کی ایک نہ چلی۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، بڑی سوانح عمری صفحہ ۱۸)

اس کا ہر دار خالی گیا۔ اس رسوائی کی وجہ سے وہ چاہتا تھا کہ اُڑ کر سمندر کے پار نکل جائے، لیکن حضرت کی جوتیوں نے ہوا میں پرواز کی اور اس کو گھیر کر زمین پر لے آئیں۔[1] خواجۂ اجمیری کی اس کرامت کے بیان کے بعد صرف دو شعر مدح کے کہے ہیں :

مکمل ولی آج خواجہ ہے او ❊ دنیا دین کا دیکھ راجا ہے او
پرستش کریں جن و انسان مل ❊ دو عالم دیکھو شہ سوں باندھے ہیں دل

اس کے بعد خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی مدح لکھی ہے :

سچا قطب یو قطب اقطاب ہے ❊ دنیا دین میں سچ یو مہتاب ہے
قطب دین تو نام ہے شاہ کا ❊ اُجالا دسے مکھ اوپر ماہ کا
دلی شہر میں قطب اظہر ہوا ❊ ہندستان تب سوں منور ہوا
عجب نور تھا مکھ اوپر ذات کا ❊ دسے چاند جوں چودھویں رات کا
دیکھو شہ کو خواجہ (نے) خواجہ کیے ❊ دو عالم میں دیکھلا اوجالا کیے
مرید دیکھ حق جس کو ایسا دیا ❊ کتے زاہداں میں اُسے انبیا (دکھلا)

حضرت شیخ فرید الدین گنج شکر کے بارے میں معظم کہتے ہیں کہ انھوں نے طلبِ حق میں مختلف دیار و امصار چھان ڈالے، لیکن انھیں اصلی نعمت حضرت خواجہ قطب الدین

---

[1] اس ناکامی اور نامرادی نے جے پال کی آنکھیں کھول دیں اور وہ حضرت خواجہ کے دائرۂ ارادت میں شامل ہوگیا۔ کہتے ہیں کہ جے پال نے حضرت سے التجا کی کہ مجھ کو عمرِ جاوید عطا کی جائے تاکہ تلافیِ ماضی ہوسکے۔ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ تو قیامت تک زندہ رہے گا، مگر چشمِ خلائق سے پوشیدہ رہے گا، چناں چہ مشہور ہے کہ جے پال اب تک زندہ ہے اور ہر شبِ جمعہ کو زیارت روضۂ مقدسہ کے لیے حاضر ہوتا ہے، جو زائرین راستہ بھٹک جاتے ہیں ان کو راہ بتانے کی خدمت اس کے ذمے ہے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد حضرت نے جے پال کا نام عبد اللہ رکھا تھا۔
(بڑی سوانح عمری صفحہ ۲۰)



کی خدمت میں حاصل ہوئی۔ حضرت فرید نے بھوک پیاس کی پروا کیے بغیر تلاشِ حق میں جو دشت نوردی کی تھی اس کا اجر انھیں یہ ملا کہ مٹی ان کے لیے شکر بن گئی۔[1]

کیے سیر سب بر اور بحر کا ❊ ہر یک ملک کا اور ہر یک شہر کا
نہ دیکھے خدا کو بیابان میں ❊ یہاں آکے دیکھے ہیں اک آن میں
کتک دیس لگ شیخ جنگل پھرے ❊ مطالب یہاں آکے حاصل کرنے
بھو کے رہ کے جنگل پھرے سو اجر ❊ شکر کر لیے شیخ ماٹی بھیتر

شاہ معظم کا بیان ہے کہ شیخ فرید کی تعلیم و تربیت کی ذمہ دار اُن کی والدہ تھیں۔ انھوں نے اپنے لڑکے کی تربیت کچھ اس ڈھنگ سے کی کہ یہ لڑکا سبھوں کے لیے شیخ ہوگیا۔ شیخ فرید نے چاروں راستے طے کیے تھے، تبھی وہ واصلِ حق ہوئے۔

اول والدہ شہ کی راشد ہوئے ❊ دیکھو شیخ تب سب کے مرشد ہوئے
دیکھو چار رہ پر سو جب آئے ہیں ❊ وصل حق سوں تب شیخ نے پائے ہیں

معظم، حضرت نظام الدین اولیا کی مدح کرتے ہوئے دو باتوں کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کرتے ہیں۔ ایک ان کا لنگر خانہ، جس میں ہر روز ہزاروں آدمی کھانا کھاتے تھے۔ دوسرے ان کی محفل سماع۔ کہتے ہیں کہ اُن کی بارگاہ میں ہزاروں قوال اور سازندے جمع تھے اور حضرت صبح و شام ساز و سرود میں مستغرق رہتے تھے۔ معظم کا یہ بیان کچھ تو مبالغہ آمیز بیانات اور روایات پر بغیر کسی تحقیق کے اعتبار کر لینے کا نتیجہ ہے اور کچھ تو

---

[1] صاحب سیر الاولیا نے لکھا ہے کہ شیخ فرید نے طے کا طریقہ اختیار کیا تھا۔ چھٹے دن ضعف اس قدر غالب آیا کہ آپ نڈھال ہوگئے۔ اگرچہ افطار کا وقت ہوگیا تھا، لیکن غیب سے کچھ نہ پہنچا۔ رات گئے بھوک سے بے تاب ہوکر حضرت نے چند کنکریاں زمین سے اٹھا کر منہ میں ڈال لیں، یہ کنکریاں شکر کی ڈلیاں بن گئیں، تبھی سے وہ پیر شکر بار اور گنجِ شکر کہلانے لگے۔ (سیر الاولیا، صفحہ ۷۴)

اہلِ طریقت کے اس غلط تصور کا نتیجہ ہے کہ وجد و حال، سوز و مستی اور جذب و بے خودی پابندیِ شریعت سے اونچی حالت ہے۔ اس لیے کہ یہ صحو و سکر معرفتِ الٰہی کا نتیجہ ہوتا ہے، جس کو معرفت نصیب ہو، اس کے لیے شریعت ایک ادنیٰ چیز ہے۔ مغلوب الحال ہونا انسان کی مجبوری اور معذوری ہے، جس سے تکلیفِ شرعی ساقط ہو جاتی ہے، لیکن اس سے مغلوبیت کی حالت شریعت سے بہتر کیوں کر ہو سکتی ہے اور پھر صوفیہ پر غلبۂ حال عموماً جنونِ دوری کا حکم رکھتا ہے، جس کا جنون دوریِ جنونِ قائم بن جاتا ہے، اُس کو مجذوب کہتے ہیں اور مجذوب کا حال اپنی جگہ جیسا کچھ ہو، وہ منصبِ رشد و ہدایت کے لائق نہیں ہوتا۔ حضرت نظام الدین اولیا جیسے صاحبِ رشد، مرجعِ خلق اور ہادیِ دین کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ رات دن ساز و نغمہ کے کیف سے مست و بے خود رہتے تھے، نری غلط بیانی ہی نہیں بلکہ ان کے منصبِ ہدایت پر اتہام ہے۔[1] اس کے آگے معظم کہتے ہیں کہ نظام الدین اولیا مجالسِ سماع میں حاضرین کو شرابِ معرفت پلاتے تھے، جس کسی کو یہ شراب میسر آتی وہ کامل اور واصل ہو جاتا:

یو صفرا (سفرا) شہنشاہ کا عام تھا ❊ فراواں کتک جنس کا طعام تھا
تصرف اتھاشاہ کا بے شمار ❊ کلاونت تھے شاہ (کنے) کئی ہزار
بجنتر کتے شاہ کے قوال تھے ❊ وہ قوال خود مستِ احوال تھے
کبھی گائیں جب وہ حسینی مقام ❊ مجالس کو تب حال آوے تمام

---

[1] صاحب سیر الاولیا نے حضرت نظام الدین اولیا کی سماع سے دل چسپی، سماع کی محفلوں، اس کے جواز، آداب اور اہمیت کے بارے میں بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، جس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نظام الدین اولیا سماع کو اہمیت ضرور دیتے تھے، لیکن صبح و شام اسی میں مستغرق نہیں رہتے تھے۔ ملاحظہ ہو،
(سیرۃ الاولیا، نواں باب، صفحہ ۴۸۹)



کبھی شوق میں آ بجاویں رباب ❊ نہ رہتا تھا کچھ بھی عالم میں تاب
کبھیں مست ہو چنگ بازی کریں ❊ او عشاق کی کارسازی کریں
اکابر مجالس میں راتے رہیں ❊ سدا مے محبت سو ماتے رہیں
اتھاشاہ کا ہاتھ جم کا وہ جام ❊ پیاسو ہوا ہے وہ تحصیل تام
پیاسو دیکھو تو رح فاضل ہوا ❊ وہ کامل ہوا اور واصل ہوا

حضرت نظام الدین اولیا کی مدح کے بعد کہتے ہیں کہ ایک روز حضرت کو حکم ہوا کہ خواجہ منتجب الدین[1] کو ملک دکن پر مقرر کریں۔ حضرت نے تعمیل حکم میں ان کو کئی اولیا اور اتقیا کے ساتھ دکھن کی طرف روانہ کیا۔ خواجہ منتجب الدین کئی منازل طے کرنے کے بعد بلوری[2] کے مقام پر پہنچے تو فجر کا وقت تھا۔ انھوں نے اذاں دی۔ اذاں کی آواز کے کان میں پڑتے ہی اس قطعے کے بسنے والے تمام کافر پتھر ہو گئے۔ معظم کہتے ہیں کہ جس کسی کو ہمارے اس بیان پر شبہ ہو وہ بلوری جا کر ان پتھروں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے اور ہمارے بیان کی تصدیق کرے۔

غار ہائے ایلورا کے بارے میں دکھن میں یہ روایت آج بھی مشہور ہے کہ یہ اس آبادی کا ایک حصہ ہے جو حضرت منتجب الدین کی بد دعا سے پتھر میں تبدیل ہو گیا تھا۔ بزرگانِ دین کے تذکرے اس قسم کی من گھڑت روایتوں سے بھرے پڑے ہیں۔

اس طرح کی بے سر و پا روایتوں پر معظم کے اس درجہ یقین کو اُن کے حسنِ ظن اور جوشِ عقیدت کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے۔[3]

---

[1] بعض تذکرہ نگاروں نے (مثلاً معارج الولایت) آپ کو شیخ العالم خواجہ فرید الدین گنج شکر کا مرید اور خلیفہ بتایا ہے، محبوب ذوالمنن، صفحہ ۸۱۹، برکات الاولیا، صفحہ ۱۱
[2] ایلورا
[3] صاحب برکات الاولیا نے بھی اس روایت کی طرف اشارہ کیا ہے (برکات الاولیا، صفحہ ۱۲)

کتک ملک طے کر کے یاں آئے جب ٭ امر پیر کا سب بجا لائے تب
ولایت کی تشریف سب پائے تھے ٭ اسی کیچ قوت سو یاں آئے تھے
فجر کا دیے بانگ شہ نے پکار ٭ نبی کے کیے دین کو آشکار
ہوا بانگ کا ملک میں سب نشر ٭ ندا سن کے کافر ہوے سب پتھر
بلوری میں جا کوئی نظارا کریں ٭ ہمارا سخن وو چ باور دھریں

شاہ معظم ایک اور روایت یہ بیان کرتے ہیں کہ بارگاہِ ایزدی سے منتجب الدین کے لیے روزانہ زرین اور جواہر نگار خلعتوں کے طبق اترا کرتے تھے۔ حضرت یہ طبق پہلے اپنے سر پر رکھتے، پھر اس طبق میں سے لباسِ فاخرہ نکال کر زیب تن کرتے اور دوسرے دن فقرا میں تقسیم کر دیتے۔ اسی بخشش کی وجہ سے ان کا نام زر زری بخش مشہور ہو گیا تھا۔[1]

سدا حق سوں خلعت اترتا اتھا ٭ سدا پیار حق ان پہ دھرتا اتھا
اتر آئے ہر روز درگاہ سوں ٭ سدا نو بہ نو خلعتاں شاہ کوں
اتر آئے کسوت سدا زرزری ٭ امولک رتن ہے بدل جوہری
طبق لے کے او شاہ سر پر دھریں ٭ اپیں پین کر شاہ بخشش کریں

اسی سلسلے میں حضرت کی یہ کرامت بھی بیان کی ہے کہ ایک مقامی راجا کی لڑکی کو، جو بہت خوب صورت تھی، حضرت کے دیدار کا شوق پیدا ہوا اور وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ گھر سے چل کھڑی ہوئی۔ حضرت کی بارگاہ میں پہنچی تو ان کے جاہ و جلال کو دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ قریب ہی ایک خشک باولی تھی۔ راج کماری کے دل میں وسوسہ آیا کہ اگر حضرت

---

[1] مترجم روضۃ الاولیا المعروف بہ نفحات الاصفیا نے اپنے ذخیرۂ قلمی کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ خطاب حضرت نظام الدین اولیا کا عطا کیا ہوا ہے۔ روضۃ الاولیا، صفحہ ۵۲۔
معظم کی روایت تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ برکات، محبوب ذی المنن اور تاریخ فرشتہ میں بھی ملتی ہے۔



صاحبِ کرامت ہیں تو اس اندھی باولی کو پانی سے بھر دیں۔ راج کماری کے اس خطرے کا حضرت کو القا ہو گیا اور انھوں نے باولی پر نظر ڈالی۔ بس کیا تھا باولی سے سیال سونا اُبلنے لگا۔[1] معظم کہتے ہیں کہ آج بھی جو لوگ حضرت کے عرس میں جاتے ہیں، اس باولی کو ضرور دیکھتے ہیں، جو "سُنّا بائیں" (سونے کی باولی) کہلاتی ہے۔

کتے بائیں اول سو خالی اتھی ٭ نہ تھا اُس میں پانی کتے اک رتی
رکھی دل میں یو بائیں پانی بھرے ٭ کہوں گی بڑے پیر ہیں یو کھرے
اتھا کشف شاہ کو علام الغیوب ٭ عنایت اتھا سب کشاف القلوب
دیکھے بائیں پر شہ نے بھر کر نظر ٭ ابل کر چلی بائیں سُنّتے سے بھر
عروس (عرس) کے بدل خلق آتی جتی ٭ ہنوز لگ اسے سنّا پائیں کتی

کچھ مدت بعد منتجب الدین کو القا ہوا کہ ان کا وقت موعود آن پہنچا۔ آپ نے شاہ برہان الدین غریب کو بلا کر اس کی اطلاع دی اور فرمایا کہ اب تم دکھن پر حکومت کرو۔ حضرت علی کا علم ان کے حوالے کیا اور جتنے مرید، فقرا اور اولیا ساتھ تھے، ان سب کو شاہ برہان کے ہم راہ کر دیا۔ راستے میں کئی اولیا اس قافلے کے ساتھ ہو لیے۔ معظم کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے منتجب الدین کے ہم راہ برہان الدین غریب بھی آئے تھے، لیکن کسی تذکرے سے اس کی توثیق نہیں ہوتی۔ بعض تذکرہ نگاروں[2] کا بیان

---

[1] روضۃ الاولیا نے بھی تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ یہ روایت بیان کی ہے، اور لکھا ہے کہ حضرت کی اس کرامت سے متاثر ہو کر سونا بائی نے اسلام قبول کیا اور اپنے پیر کی نظرِ کیمیا اثر سے تھوڑے ہی عرصے میں بڑی عارفہ اور کاملہ ہو گئیں۔ سونا بائی کا مزار حضرت کے گنبد کے برابر چنبیلی کے درخت کے نیچے زیارت گاہ خلائق ہے۔ ملاحظہ ہو (ترجمۂ روضۃ الاولیا، صفحہ ۵۴)

[2] روضۃ الاولیا، بہ حوالہ محبوب ذی المنن، صفحہ ۱۵۴

ہے کہ حضرت نظام الدین اولیا نے مولانا برہان الدین غریب کو اپنے سات سو مریدوں کے ساتھ، جن میں بعض پالکی نشین تھے، دکھن روانہ کیا تھا اور بعضوں[1] نے لکھا ہے کہ پہلے حضرت منتجب الدین زر زری بخش کو بھیجا اور جب دیوگیر میں ان کا انتقال ہوا تو حضرت برہان الدین غریب کو خرقۂ خلافت عطا کر کے دکھن کی ولایت پر مامور کیا۔ یہ واقعہ حضرت نظام الدین اولیا کے انتقال سے کچھ ہی پہلے کا ہے۔

بہرحال معظم کے بیان کے مطابق حضرت برہان الدین غریب چودہ سو اولیائے کامل کے ساتھ ایلورا سے دولت آباد روانہ ہوئے۔ راستے میں خلقِ خدا انھیں دیکھ کر ان کی معتقد ہوتی گئی۔[2] دولت آباد پہنچ کر حضرت نے خود تو وہیں سکونت اختیار کی، لیکن اپنے ساتھیوں کو رشد و ہدایت کے لیے مختلف مقامات کو روانہ کیا:

برابر جتنے اولیا سات تھے ﴿ نفی ذات میں ہو کر اثبات تھے
دیے ملک سب باٹ کر شاہ نے ﴿ سو اس شاہ برہان جم جاہ نے
شہنشاہ کے دیک سارے فقیر ﴿ ہر اک ٹھار بیٹھے ہیں سب ہو کے پیر

معظم حضرت برہان کے کمالات کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انھیں سماع کا بہت شوق تھا اور اس تعلق سے تقریباً وہی بات کہی ہے جو وہ نظام الدین اولیا کے بارے میں کہہ آئے ہیں:

بجز راگ دیگر نہ کچ کام تھا ﴿ سدا مے محبت کیرا جام تھا[3]

---

[1] تاریخ فرشتہ، جلد دوم، صفحہ ۵۴۱
[2] واضح رہے کہ ایلورا سے دولت آباد چار پانچ کوس سے زیادہ فاصلے پر واقع نہیں ہے۔
[3] صاحبِ سیر الاولیا کا بیان ہے کہ "مولانا برہان الدین کو سماع میں پہلے درجے کا غلو تھا اور آپ کے ساتھ آپ کے یاروں کے رقص میں ایک جداگانہ طرز تھی، چناں چہ آپ کے یاروں کو اور لوگ برہانی کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ (سیر الاولیا، صفحہ ۲۷۹)



حضرت برہان الدین غریب کے بعد شاہ راجو قتال، حسن سجزی، شاہ زین الدین، پیر تین دمڑی، شاہ خوندمیر، شاہ کالے، شاہ حسین گنج رواں، شاہ سانگڑے سلطان، کے علاوہ اور کئی بزرگوں کا ذکر کیا ہے۔ تعجب ہے کہ خانوادۂ چشت کے اس تذکرے میں شاہ حسین گنج رواں اور شاہ سانگڑے سلطان کا تو ذکر ہے جو علی الترتیب سہروردی[1] اور رفاعی[2] سلسلے سے تعلق رکھتے تھے، لیکن شیخ نصیر الدین چراغِ دہلی کو نظرانداز کر دیا ہے۔ حالاں کہ سلسلۂ چشت کی وہ ایک اہم کڑی ہیں اور بندہ نواز کے توسط سے انھیں کا فیض دکن میں عام ہوا ہے۔

مثنوی کے آخری حصے میں معظم نے اورنگ زیب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انھوں نے شاہ برہان الدین غریب کی گنبد میں پناہ لی تھی تاکہ حضرت کی برکت سے گناہ بخشے جائیں:

دیکھو بادشہ یہ ہندوستان کا ﴿ سو اس باغِ بستاں گلستان کا
کتے نام اس کا ہے اورنگ زیب ﴿ او مقبول حق کا ہے بے شک و ریب
لیا شہ کی گنبد کا آکر پناہ ﴿ برکت سوں حق شہ کے بخشے گناہ

ابو نصر خالدی صاحب نے ان اشعار سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ:

"یعنی محی الدین اورنگ زیب عالم گیر نے شہ کی گنبد کا پناہ لیا۔ مراد یہ ہے کہ اس کی لاش برہان الدین غریب کی درگاہ کے احاطے میں دفن ہے۔[3]"

اورنگ زیب شاہ زین الدین کے روضے کے پائین[4] دفن ہیں۔ اس لیے خالدی صاحب

---

[1] روضۃ الاولیا، المعروف بہ نفحات الاصفیہ، صفحہ ۱۲۰
[2] تاریخ قندھار، صفحہ ۲۰۸
[3] قدیم اردو، جلد اول، صفحہ ۲۲۳
[4] گنبدِ اطہر (حضرت زین الدین) کے جانبِ غرب سلطان اورنگ زیب غازی نور اللہ مرقدہٗ حسبِ وصیت اپنے مولانا کے ظلِ عاطفت میں آسودہ ہیں۔ روضۃ الاولیا المعروف بہ نفحات الاصفیہ، صفحہ ۱۲۷

کی تاویل درست نہیں معلوم ہوتی۔ پھر معظم کے شعر میں "گنبد" اور "پناہ" کے لفظ بھی غور طلب ہیں۔

دکھن میں اب بھی یہ روایت مشہور ہے کہ صوفی سرمد کی شہادت کے بعد اورنگ زیب کا سکونِ قلب جاتا رہا تھا اور راتوں کی نیند حرام ہو گئی تھی۔ ایک لمحہ کے لیے بھی آنکھ لگتی تو ایسا محسوس ہوتا کہ کسی نے چارپائی الٹ دی ہے۔ برسوں وہ خوابِ شیریں کی نعمت سے محروم رہے، یہاں تک کہ حضرت برہان الدین غریب کی درگاہ پر فاتحہ خوانی کے لیے حاضر ہوئے۔ روضۂ مبارک میں قدم رکھتے ہی انھیں ایسا محسوس ہوا کہ اُن کا کھویا ہوا سکون مل گیا اور انھیں نیند آگئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معظم نے متذکرہ بالا شعر میں اسی روایت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

مثنوی کو ختم کرتے ہوئے معظم کہتے ہیں کہ سالک کو چاہیے کہ شیخ، رسول اور اللہ کو ایک سمجھے اور خود اپنا اور اپنے پیر کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

معظم کتے قادری ہے فقیر ؞ گناہ گار، عاجز، فقیر و حقیر
ملا مجہ کو مرشد ہوا میں امین ؞ مرے حق پورا شد ہو آپیں امین
یہاں آکے طالب ہو سجدہ کیا ؞ مجھے پیر نے حق دکھا کر دیا

مثنوی مناجات پر ختم ہوتی ہے:

مناجات یارب یو کرنا قبول ؞ بحق محمدؐ و آلِ رسول

معظم کی یہ مثنوی بھی شجرۃ الاتقیا کی طرح خاصی طویل ہے، لیکن شجرۃ الاتقیا کی گرمیِ گفتار اس میں نہیں ہے۔ اگرچہ بزرگانِ سلسلہ کے کمالات و کرامات کے ذکر میں زورِ بیان دکھانے کی بڑی کوشش کی ہے، لیکن خلوص کی وہ شدت اور عقیدت کا وہ جوش نہیں ہے، جو شجرۃ الاتقیا میں نظر آتا ہے۔ اس لیے ادبی اعتبار سے بھی یہ مثنوی شجرۃ الاتقیا سے بہت پست ہے، اگرچہ شجرۃ الاتقیا میں بھی بہت سی ایسی روایتیں بیان کی ہیں جو حقائق کے خلاف ہیں، لیکن زیرِ نظر تبصرہ مثنوی میں اس قسم کی روایتوں کی کثرت ہے، جس کی وجہ سے تذکرے کے اعتبار سے بھی اس کا وزن گھٹ جاتا ہے۔



# شجرۃ الاتقیا

شاہ معظم کی منظومات کے نسخے مختلف کُتب خانوں اور خانگی ذخیروں میں مل جاتے ہیں، لیکن شجرۃ الاتقیا کے صرف ایک ہی نسخے کا پتا چل سکا ہے، جو کتب خانۂ نواب سالار جنگ (مخطوطہ نمبر ۱۳۱ تصوف) میں اُنھیں کی ایک دوسری مثنوی گلزارِ چشت[1] کے ساتھ مجلد ہے۔ یہ نسخہ چالیس صفحات اور (۴۸۶) اشعار پر مشتمل ہے۔

مولوی ہاشمی مرحوم کتب خانۂ نواب سالار جنگ کے اس نسخے کو متعارف کرانے سے بہت پہلے اس مثنوی کے ایک اور نسخے کا "دکن میں اردو" میں ذکر کر چکے تھے، جو اُنھوں نے کسی کتب فروش کے ہاں دیکھا تھا۔[2] اس نسخے کا پتا نہ چل سکا۔ ہاشمی صاحب نے اس نسخے سے جو نمونہ دیا ہے، اُس میں صرف ابتدائی دو شعر شجرۃ الاتقیا کے ہیں اور باقی آٹھ شعر مفتاح الاسرار کے ہیں۔[3]

معظم کا بیان ہے کہ اس نے اس مثنوی کے پانچ سو ابیات کہے ہیں:

---

[1] مولوی ہاشمی مرحوم نے اس مثنوی کا نام گلزارِ جنت لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو نواب سالار جنگ مرحوم کے کتب خانے کی قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست، صفحہ ۷۸۵

[2] نصیر الدین ہاشمی، دکن میں اردو، چوتھی اشاعت، صفحہ ۲۱۲

[3] اس کے اسباب کے لیے مفتاح الاسرار کے نسخوں کی تفصیل ملاحظہ ہو۔

اتا پانچ سو بیت بولا ہوں میں ؛ جو بولو کہے سو چہ کھولا ہوں میں

کتب خانہ نواب سالار جنگ کے نسخے میں صرف (۴۸۶) ابیات ہیں۔

شاہ معظم نے اس مثنوی کے موضوع اور شانِ نزول کے بارے میں لکھا ہے:

امر مجھ ہوا خواب میں کائنات ؛ تو اظہار کر گنج مخفی کی بات

عبادت میں حق کی تو مشغول ہو ؛ کدورت یہ دنیا کی سب دل سوں دھو

صفت کر نبی کا دل و جان سوں ؛ معزز اُسے جان ایمان سوں

اول پانچ تن کا ثنا بول کر ؛ مراتب انو کا تو کہہ کھول کر

نبوت، ولایت کی کر بات تو ؛ اتا اُٹھ قلم لے اپس ہاتھ تو

نبی کے امر پر یو بولا ہوں میں ؛ چھپے راز کو تو چہ کھولا ہوں میں

اور مثنوی کا نام بھی رسولِ کریم کے حکم کے مطابق شجرۃ الاتقیا رکھا:

ہوا مجہ امر خاتم الانبیا ؛ اسے نام رکھ شجرۃ الاتقیا

معظم کے بیان سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس مثنوی کا موضوع تصوف و معرفت ہے۔

مولوی نصیر الدین ہاشمی کو بھی یہی غلط فہمی ہوئی ہے اور انھوں نے لکھا ہے:

"اول الذکر دونوں مثنویاں (شجرۃ الاتقیا اور آزاد نامہ) تصوف میں ہیں"[۱]۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ بنیادی طور پر یہ حضرت بندہ نواز کے اس سلسلۂ فیض کا تذکرہ ہے، جو حضرت جمال الدین مغربی کے توسط سے شاہ معظم کی زندگی میں علی پیر تک پہنچا تھا۔ شاہ معظم نے اس سلسلے کے تمام بزرگوں کا ذکر ترتیب وار کیا ہے اور ان کے مختصر اور اہم حالاتِ زندگی اور کرامات بیان کرتے ہوئے، اُن میں سے ہر ایک کی معرفت و ولایت اور محاسن و مکارم کی تعریف و توصیف کی ہے۔ احوال و کوائف ہی کے ضمن میں تصوف کے نکات بھی بیان کیے ہیں۔ اس طرح یہ رسالہ خانوادۂ چشت کی بیجاپوری شاخ کا منظوم تذکرہ بھی ہے

---

۱ نصیر الدین ہاشمی، دکن میں اردو، چھٹی اشاعت، صفحہ ۲۶۹



اور موضوع کے اعتبار سے منقبت بھی۔ موضوع کی اس مناسبت کے اعتبار سے اس مثنوی کا نام شجرۃ الاتقیا موزوں، جامع اور چپیدہ نام ہے۔

مثنوی کا آغاز حمد سے ہوتا ہے، جس کے بعد نعتِ رسول اور منقبتِ صحابہ ہے۔ حمد میں مضامین کی نوعیت اور بیان کا اسلوب کم و بیش وہی ہے، جو مفتاح الاسرار میں ملتا ہے:

الٰہی توں قادر ہے صاحب غنی ؛ تو رزاق مطلق ہے سمرت دھنی

ترا نام قادر سزاوار ہے ؛ ترے نام کا سب کو آدھار ہے

اسم بامسمیٰ ہے تیرا حکیم ؛ سمیعٌ بصیرٌ علیمٌ حکیم

توں حاکم ہے حکمت میں پورا دسا ؛ ترا نام نا کچھ ادھورا دسا

علم غیب کا پیچ یو دھرتا ہے تو ؛ نئی حکمتیں تو چہ کرتا ہے تو

فلک بے ستوں تو معلق کیا ؛ ستاروں سے کیا خوب رونق دیا

لگا تس میں قندیل تو نور کی ؛ چراغاں لگا کر چندر سور کی

یو دن رات کیا خوب بنایا ہے تو ؛ یو خلعت عجائب نپایا ہے تو

یو خورشید سوں روز روشن کیا ؛ رین کو توں چندر سوں گلشن کیا

یو بستر زمیں کا بچھایا ہے تو ؛ دیکھا کر یو قدرت ریجھایا ہے تو
(دکھا) (رجھایا)

برستا ہے باراں زمیں کے اوپر ؛ تو ہوتا ہے دنیا میں الواں ثمر

بچھا تس اوپر سفرۂ خاص و عام ؛ کھلاتا ہے خلقت کو الواں طعام

پھراتا ہے دن رات گردش فلک ؛ نپاتا ہے حکمت سوں جن و ملک

او کرتا ہے کیا بادشاہی عظیم ؛ دیکھاتا ہے حکمت اپیں وہ حکیم
(دکھاتا)

محیط ہے کتے سب میں موجود او ؛ ہے مطلق کتے دیک معبود او

وہی دیک دریائے وحدت ہوا ؛ او وحدت کتے سو ہی کثرت ہوا

ہر یک روپ میں ایک مظہر ہے او ؎ اپیں رہ دیکھانے کو رہبر ہے او
منگا حق اپس کو کروں آشکار ؎ نکل شوق سوں گنج مخفی سے بھار

رسولِ کریم کی نعت کے سلسلے میں کہتے ہیں کہ وہ خلیفۃ اللہ فی الارض ہیں، صاحبِ فرقان ہیں اور صاحبِ معراج ہیں:

محمد عجب نام اپنا رکھا ؎ اپس کو چھپیا اور رسول کر دیکھا
نبی کا اول نور اظہار کر ؎ کیا سب اُسی نور سوں بحر بر
نبی کے طفیلوں دیکھے کردگار ؎ دو عالم اوپر تونچہ دھرتا ہے پیار
اولوالعزم اور اُن کو مرسل کیا ؎ کرم کر کیا خاتم الانبیا
نبی کو سو نائب کیا آپنا ؎ نبی کو خلافت دیا آپنا
دیا پیار سو تاج لولاک کا ؎ عطا اُس کیا تخت افلاک کا
دیا حق نے اپنا حکومت اُسے ؎ جکچہ شان و شوکت سو قدرت اُسے
بلا کر اُسے رب نے معراج کو ؎ دیا پیار سوں تخت اور تاج کو
یو خلقت کیا حق نبی کے بدل ؎ یو خلعت دیا حق نبی کے بدل

صحابہ کی منقبت کے بعد نبوت اور ولایت کے تقابلی صفات کے ذکر میں بڑا زورِ بیان صرف کیا ہے اور ان کے نازک فرق کو واضح کرنے کے سلسلے میں اپنی نکتہ رسی، دقتِ نظر اور غیر معمولی بصیرت اور آگہی کا ثبوت دیا ہے:

نبوت کی مسند نبی کو دیا ؎ ولایت علی کو عنایت کیا
نبوت ہے چشمہ ہو آبِ حیات ؎ ولایت کے صدقے سوں آتا ہے ہات
نبوت سو خلقت میں جوں ہے شجر ؎ ولایت کتے اُس کو آیا ثمر
نبوت خزانہ یو اسرار ہے ؎ ولایت طرف سو ہے اظہار ہے
نبوت ولایت یو ہے یک دگر ؎ ولایت کتے ہیں نبی کا امر



نبوت مثالے کہ جیوں سور ہے ؎ ولایت سو اُس سور کا نور ہے
نبوت کا زیور ولایت سو ہے ؎ ولایت کو قوت نبوت سو ہے
نبوت ولایت کی ایک ہے مزاج ؎ یو دو مل کے قدرت کو دیتے رواج
نبوت جواہر کی جیوں کھان ہے ؎ ولایت سو جوہر یو ایمان ہے
نبوت ولایت سوں سب کام ہے ؎ دیکھو تو ہی خلقت کو آرام ہے

نبوت اور ولایت کے موضوع پر اظہارِ خیال کے بعد پھر ایک بار وہ حضرت علی کی منقبت کی طرف رجوع کرتے ہیں:

دیا حق اُسے سیف اور یہ قلم ؎ حوالے کیا دین کا اُس علم
علی پر کرم حق ازل سو کیا ؎ تو مہرِ ولایت علی کو دیا
علی کے کتے ہات سب کام ہے ؎ علی کیچہ قوت سوں اسلام ہے
علی کے کرم سو یو ہوتے ولی ؎ علی سوں کھولا (دکھلا) سب خفی اور جلی
علی کیچہ ہے ہات آبِ حیات ؎ علی کیچہ صدقے سوں آتا ہے ہات

شاہ معظم کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی نیابت رسولِ کریم کو عطا کی اور حضرت علی کو نبی کریم کا نائب مقرر کیا۔ دنیا میں جتنے اولیا ہوئے ہیں اور ہوں گے وہ سب نائبِ علی ہیں اور انھیں سے ہر شہر، ہر ملک اور ہر زمانے میں بندگانِ خدا نے راہ معرفت پائی ہے:

نبوت نبی کو دیا آشکار ؎ علی کے دیا ہات حق ذوالفقار
نیابت او اپنا نبی کو دیا ؎ نبی کو سو نائب علی کو کیا
علی کیچہ نائب ہیں سارے امیر ؎ جہاں لگ یو ہیں پیر اور سب فقیر
ہر یک شہر میانے ہیں کئی اولیا ؎ ہر یک راہ دیکھانے (دکھلانے) کو ہیں اتقیا
ہر یک ملک میں دیک اصحاب ہیں ؎ ہر یک ملک میں قطب اقطاب ہیں
ہر یک ملک کو ایک والی کیا ؎ ہر یک باغ کو ایک مالی کیا

اسی وضع دکھن اوپر کر کرم ؎ دیا بھیج والی اپیں کر رحم

یہ والیِ دکھن حضرت بندہ نواز گیسو دراز ہیں، یعنی حضرت علی کا سلسلۂ فیض حضرت بندہ نواز کے توسط سے دکھن تک پہنچا ہے۔

یہیں سے اصل رسالہ شروع ہوتا ہے اور شاہ معظم حضرت بندہ نواز سے علی پیر تک اس سلسلے کے بزرگانِ دین کے حالات سلسلہ وار بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔

مثنوی کے اس ابتدائی حصے کے مضامین اور موضوعات کی ترتیب پر نظر ڈالنے کے بعد جب ہم "سبب تصنیف" سے متعلق اشعار تک پہنچتے ہیں تو یہ شعر ایک سوالیہ نشان بن کر سامنے آتا ہے:

اول پانچ تن کا ثنا بول کر ؎ مراتب انوں کا تو کہہ کھول کر

اس لیے کہ شاہ معظم نے حمد اور نعت کے بعد صحابہ کی منقبت کی ہے اور سببِ تصنیف کی وضاحت کے بعد نبوت اور ولایت کے مدارج و مقامات کی تشریح کرتے ہوئے پنجتنِ پاک میں سے سرچشمۂ فیض کی حیثیت سے صرف حضرت علی کی پھر ایک بار مدح سرائی کی ہے اور پنجتن پاک کا اچٹتا سا ذکر کیا ہے۔

اول پانچ تن پاک پیدا کیا ؎ اونوں کے سبب سب ہویدا کیا

اس لیے قیاس ہوتا ہے کہ اس رسالے میں عرف عام کے خلاف پانچ تن (پنجتن) سے مراد رسولِ اکرم صلعم اور ان کے چار اصحاب ہوں گے اگرچہ شاہ معظم جیسے صاحبِ طریقت سے اس نئی تاویل کی توقع نہیں کی جا سکتی لیکن متذکرہ بالا پہلا شعر نعت اور مدح صحابہ کے بعد آیا ہے اس لیے اس قیاس کے لیے گنجائش نکل آئی ہے اور چوں کہ آگے "پنجتن پاک کے مراتب کھول کر بیان نہیں کیے ہیں"۔ اس لیے بھی اس قیاس کو مزید تقویت ہوتی ہے۔

حضرت بندہ نواز گیسو دراز کی مدح میں شعرائے دکھن نے بڑے شان دار قصیدے لکھے ہیں، جن میں فکر و فن کا کمال دکھانے کے لیے بڑا زور لگایا ہے۔ معظم نے ان شعرا



کے برخلاف انتہائی سیدھے سادے انداز میں مدح کہی ہے۔ اس سادگی اور بے تکلفی کی وجہ سے مدح میں بڑی دل کشی، جاذبیت اور تیکھا پن پیدا ہو گیا ہے اور ممدوح کے جو اوصاف اور کمالات بیان کیے گئے ہیں، ان کے مبنی بر حقیقت ہونے کا وہ احساس پیدا ہوتا ہے، جس سے روایتی قصیدہ بالعموم محروم رہتا ہے:

مبارک عجب نام ہے شاہ باز ؎ محمد حسینی ہیں گیسو دراز

اونیں خانوادہ ہے ایک چشت کا ؎ دیا ہات حق اُس کلی بھشت کا

وہی دیک دکھن کو حامی ہوا ؎ وہی بادشا ایک نامی ہوا

اُسی کی برکت سوں آرام ہے ؎ اُسی کے تصدق سے سب کام ہے

اُسی کے تصدق سو دکھن ہوا ؎ لقب تب یہ دکھن سو لکھن ہوا

نوازا ہے مجہ سار کے کئی گدا ؎ گدا کو نوازا کیا بادشاہ

یو برحق دسیا سچہ ہے بندہ نواز ؎ کیا دیک دکھن کو سب سرفراز

دیکھو بات رویت کی کھولا تمام ؎ کیا راز مکشوف سب خاص و عام

وہی بادشاہ سب سلاطین کا ؎ دیا تخت حق اُس دنیا دین کا

مکمل ولی سچہ ہے قطب الزماں ؎ دیکھو سب ہے خلقت کو شہہ کا اماں

حکومت ولایت سو کرتا ہے او ؎ ولیکن حمایت بھی دھرتا ہے او

دیکھو پل میں احمد کو شاہی دیا ؎ سو ترلوک کی بادشاہی دیا

لقب اُس مسما یو شہہ باز ہے ؎ عرش سو بلند اُس کی پرواز ہے

نبی کا کتے لیچہ دل بند ہے ؎ علی کا تو برحق او فرزند ہے

مسیحا کی تاثیر ہے بات میں ؎ دیا حق نے قدرت یو سب ہات میں

کیا ہات مکشوف من عرف کا ؎ دیا آشنائی فقد عرف کا

شہنشہ نے دولت دیے آل کو ؎ مریداں پہ کھولے چھپے رائز کو

کتے آل کو اپنی مسند دیے ٭ کرامت سکت سب عنایت کیے
مریداں دیکھو شہ کے قابل ہوے ٭ اکیس سوں دیکھو ایک کامل ہوے

حضرت بندہ نواز کے بعد جمال الدین مغربی، کمال الدین بیابانی، میراں جی شمس العشاق، برہان الدین جانم، امین الدین علی اعلیٰ، بابا شاہ حسینی اور علی پیر کے حالات بیان کیے ہیں۔
جمال الدین مغربی، بندہ نواز کے دادا خسر تھے[1]، لیکن معظم نے یہ رشتہ نہیں بتایا ہے بلکہ یہ لکھا ہے کہ وہ بندہ نواز کے پیش امام[2]، عالم، فاضل اور صاحب کمال بزرگ تھے:

اتھے یک شہنشاہ کے پیش امام ٭ اتھا علم تحصیل اُن پر تمام
کتے نام اُن کا اتھا شہ جمال ٭ اتھے مغربی اور صاحبِ کمال

مغربی علومِ ظاہر میں کمال رکھتے تھے، لیکن علومِ باطن سے بہرہ ور نہ تھے۔ وہ ایک دن بندہ نواز کی خدمت میں حاضر ہوے، زمین کو بوسہ دیا اور التماس کی: آپ ایک عالم کو اسرار و رموز سے آگاہ کرتے ہیں، مریدوں کو حق سے ملاتے ہیں اور رسولِ اکرم کے فیض سے بہرہ ور کرتے ہیں۔ آپ ہی کے کرم سے دکھن کی سرزمین گلشن بن گئی ہے۔ میں ایک مدت سے آپ کی خدمت میں رہتا ہوں، آپ سے بڑی توقعات وابستہ ہیں، مجھ پر بھی حق کے اسرار منکشف فرمائیے۔

بندہ نواز نے مغربی کی باتیں سننے کے بعد ارشاد فرمایا:

اول کفر اختیار کرنا یہاں ٭ اول پاؤں تل سیس دھرنا یہاں
اول زہد ایمان کرنا نذر ٭ جکچہ پیار کا چیز دھرنا نذر

---

[1] شاہ محمد علی سامانی، سیر محمدی، صفحہ ۲۵
[2] صاحب سیر محمدی نے لکھا ہے کہ مولانا بہاء الدین دہلوی "نے کئی برس تک امامتِ نماز حضرت مخدوم کی ہے" مولانا جمال الدین مغربی کا ذکر نہیں کیا ہے، سیر محمدی، صفحہ ۱۴۱۔



یو کسبی علم سب بسرنا کتے ٭ کہا پیر کا دل میں دھرنا کتے
ترک کر کے سب کفر اسلام کو ٭ ترک کر کے سب تن کے آرام کو
نفی توچہ ہونا اپیں پیر میں ٭ سو جیوں بوند ہاضم ہے دیک نیر میں
نبی میں نفی جاننا پیر کو ٭ رسول کر کے توں ماننا پیر کو
نبی کو نفی جاننا ذات میں ٭ بقا تو چہ ہوتا ہے اثبات میں
شریعت، طریقت، حقیقت سو چل ٭ دیکھو معرفت میں ہے حق کا وصل
شریعت کی رہ میں ہے آرام ئے ٭ کتے حق سوں پاتا ہے اکرام لے
طریقت سو عارف یو کامل ہوے ٭ حقیقت سوں عاشق یو عامل ہوے
سمجھ معرفت حق سوں واصل ہیں ایک ٭ درس عشق کا پڑھ کے فاضل ہیں ایک
یو صورت پرستی سے سب کام ہے ٭ یو سب تو چہ انعام اکرام ہے
یو طالب اوپر کھول دیتے ہیں پیر ٭ مرید تو چہ ہوتا ہے روشن ضمیر
سکاتے ہیں باطن میں روزہ نماز ٭ مریداں پہ کھلتا ہے تب دل کا راز
جکوئی پیر پکڑا سو سلطان ہے ٭ جسے پیر نیں اُس کو شیطان ہے
بجز راہ بر راہ پاتا نہیں ٭ بجز پیر کچھ ہات آتا نہیں
سمجھتے ہیں سب بات کامل تمیں ٭ ہیں عالم تمیں اور عامل تمیں

ان ارشادات کے سننے کے بعد مغربی سرو قد کھڑے ہو گئے۔ سجدۂ تحیت بجا لایا اور عرض کی کہ اُنھیں بیعت سے سرفراز کیا جائے۔ بندۂ نواز نے خوشی کے ساتھ ان کی درخواست قبول کی، مرید کیا، اسرار کی تعلیم دی اور تمام مراحل، منازل اور مدارج طے کرائے:

اول بات من عرف کی بول کر ٭ سو بعد از فقد عرف سب کھول کر
کیے راز مکشوف یک بات میں ٭ دیے پنج گنج[1] کا رکلی ہات میں

---

[1] موجودات خمسہ: واجب الوجود، ممکن الوجود، ممتنع الوجود، عارف الوجود، واحد الوجود

جکچہ بولنا تھا سو بولے تمام ٭ چھپا راز سب اُن پہ کھولے تمام
مجالس میں لے جا نبی سوں ملا ٭ ولایت کی تشریف اُن کو دلا
لِجا حق سوں یک پل میں واصل کیا ٭ درس عشق کا دے کے فاضل کیا

اس کے بعد خلافت عطا کی[1] اور سفر اختیار کرنے کا حکم دیا۔

سفر کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ دو طرح کے ہوتے ہیں : ایک سفرِ ظاہری اور دوسرا باطن کا سفر، جس سے قربِ ذات حاصل ہوتا ہے :

سفر ایک ظاہر تو پھرنا ہے یو ٭ سو دُسرا خدا سوں انپڑنا ہے یو

اور حج بھی دو ہیں : ایک حجِ بیت اللہ اور دوسرے دل داریِ خلق اللہ۔ پہلا حجِ اصغر ہے اور دوسرا حجِ اکبر[2] :

دیکھو ایک ہے حجِ اصغر کہتے ٭ سو دُسرا، اُسے حجِ اکبر کہتے
سفر میں تصرف کرو پانچ گنج ٭ کرو دور عالم کے سینے سوں رنج
یو کعبہ بنایا ہے کہتے خلیل ٭ سو دُسرا یو کعبہ ہے رب الجلیل

---

[1] جہاں نما علی شاہ نے بہ حوالۂ تبصرۃ الخوارقات و تاریخ خورشید جاہی لکھا ہے کہ مولانا مغربی کو فصوص الحکم میں مہارت تھی۔ اس کتاب پر بہت اعتقاد رکھتے تھے۔ آپ مرد مسافر و حکیم جہاں دیدہ تھے۔ شرحِ فصوص بڑی لطافت کے ساتھ لکھی تھی۔ حضرت بندگی مخدوم (بندہ نواز) فرماتے تھے کہ میں ایک سال اُن کے ساتھ رہا۔ کسی ایک مسئلہ پر فصوص کے بارے میں تکرار شروع ہوئی، چھ مہینے تک مباحثہ جاری رہا۔ آخر کار مولانائے موصوف نے بندگی مخدوم کے ہاتھ پر بیعت کی اور درجۂ کمال پر فائز ہوئے۔ (تاریخ محمدیہ، صفحہ ۲۰۰)

[2] سعدی نے بھی یہی کہا ہے ؎

دل بدست آوردن حج اکبر است
از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است



سفر، تبلیغ و تلقین، رشد و ہدایت اور دل داری و دل سوزی کا حکم دینے کے بعد بندہ نواز نے بشارت دی کہ اس سفر میں تم سے شاہ کمال ملیں گے اور اُن سے تمہارا سلسلۂ فیض پھلے پھولے گا، اور دعا فرمائی :

تمھارا دعا حق اجابت کرے ٭ تمھاری امر بیل منڈوے چڑھے

اسی ضمن میں معظم نے خواجہ بندہ نواز کی زبان سے اپنے دادا پیر حضرت امین کا سلوک[1] بیان کیا ہے، لیکن یہ محض اچٹتے سے اشارے ہیں اور اُن میں ربط و تسلسل بھی نہیں ہے، جس کی وجہ سے پورا بیان الجھ کر رہ گیا ہے اور اُس قاری کے لیے جو سلوک برہانی اور حضرت امین کے اجتہاد سے واقف نہیں یہ اشعار چیستاں معلوم ہوتے ہیں :

کہتے جہدِ اکبر ہے اس باٹ میں ٭ بڑا کچھ خطر ہے جنگل گھاٹ میں
سو اس راہ میں ناچہ سونا کہتے ٭ یو توشہ عمر ناچہ کھوتا کہتے
کہتے راہ میں چار منزل[2] ہے دیکہ ٭ اترتے ہیں اس ٹھار راحل ہیں ویکہ
کہتے عاشقاں راہ بھی چار ہیں ٭ ہر یک راہ میں لیچہ اغیار ہیں
سیدھے ہات کا راہ کیا خوب ہے ٭ جو اس راہ سوں آتا محبوب ہے !
موذی پانچہ ہیں راہ میں لئی کبل ٭ اول اُن کو کرنا کہتے ہیں قتل
امارہ بڑا دیو ہے راہ میں ٭ اوسے مار سٹنا کہتے چاہ میں
ہوا خمس[3] یو پانچہ ہیں راہ تمھن ٭ کہتے دور کرنا جلا کر وطن

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم الحروف کی کتاب : سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ، حیات اور کارنامے، صفحہ ۱۶۰ - ۲۱۴۔

[2] پہلے راہ اور پھر منزل کا ذکر ہونا چاہیے۔ "اول مقام، بعدہٗ راہ، بعدہٗ منزل" (کلمتہ الحقائق) یہی بے ترتیبی اگلے اشعار میں بھی ملتی ہے۔

[3] حواسِ خمسہ

اول سات مستیاں کو دینا ترک ٭ کتے ایک مستی سو رہنا سڑک

اول چار تن سو گزرنا کتے ٭ شہادت یو تو حق سو پانا کتے

حیاتی[1] منے مر کے جینا اول ٭ کتے توجہ پاتے ہیں حق کا وصل

یو راہ شش جہت کا کتے چھوڑ کر ٭ چلو لامکاں پر نظر جوڑ کر

پوچھے ٹھار پڑتے ہیں غفلت کتے ٭ جو سویا سو کھویا ہے دولت کتے

تمھارے نزد جو ہراں پانچ ہیں ٭ وہ چوری منے اپنے ور زور ہیں

اول اپنی توحید حق بوجھ کر ٭ شفاعت کرے گا قدر بوجھ کر

تمھارے کتے دم ہیں بارہ ہزار ٭ کتے یاد ہیں حق کے کرنا شمار

معظم ان ابیات میں جو کچھ کہنا چاہتے ہیں، اس کو مربوط انداز میں اختصار کے ساتھ یوں کہا جاسکتا ہے کہ راہِ سلوک میں سالک کو چوکس رہنا چاہیے، اس لیے کہ اس راہ میں بڑے نشیب و فراز آتے ہیں اور بہت نئے خطرات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس سفر میں چار راہیں اور چار منزلیں آتی ہیں۔ ان سے گزرنے کے بعد شہادتِ شہدا حاصل ہوتی ہے اور سالک کو قربِ حق نصیب ہوتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مراتب وجود چار[2] ہیں: واجب الوجود، ممکن الوجود، ممتنع الوجود اور عارف الوجود۔ ان کی چار راہیں ہیں: شریعت، طریقت، حقیقت، معرفت، چار منزلیں ہیں: ناسوت، ملکوت، جبروت، لاہوت، اور چار شہادتیں ہیں: شہادتِ مبدا، شہادتِ وجدا، شہادتِ عہدا اور شہادتِ شہدا۔

---

۱ے مُوتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا ۔ یہاں مرگ ظاہری مراد نہیں بلکہ مرگِ ارادی ہے۔

۲ے معظم نے وجوداتِ خمسہ (پانچ تن) میں سے صرف چار کی طرف اشارہ کیا ہے۔ پانچواں وجود، واحد الوجود، یہ حق سبحانہ تعالیٰ کا وجود ہے۔ اسی سے عارف الوجود، ممتنع الوجود، ممکن الوجود، اور واجب الوجود ظاہر ہوئے ہیں۔



سلوک کا آغاز مقامِ شیطانی سے ہوتا ہے[1]۔ مقامِ شیطانی کفر، شرک، نافرمانی، ہوا و ہوس، بغض و حسد اور نفسانیت سے عبارت ہے اور ان کا سرچشمہ نفسِ امارہ ہے۔ نفسِ امارہ کا محل قلبِ مضغہ اور اس کے پیدا ہونے کی جگہ روح نامیہ ہے۔ قلبِ مضغہ، تن خاکی اور روحِ نامیہ کے اتصال سے ظہور میں آتا ہے۔

نفسِ امارہ، قلبِ مضغہ کی ایک قابلیت ہے جو حواسِ خمسہ سے پیدا ہوتی ہے اور انسان کو برائی کی طرف لے جاتی ہے، اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ۔

انسان میں صفاتِ ستودہ بھی ہیں اور صفاتِ ذمیمہ بھی۔ سالک کو چاہیے کہ صفاتِ ستودہ کی حفاظت کرے اور صفاتِ ذمیمہ سے احتراز کرے۔ یہ صفات جسدِ خاکی کا خاصہ اور لازمہ ہیں اور ان کی تفصیل طولانی ہے۔ شاہ معظم نے ان میں سے صرف پانچ کی طرف اشارہ کیا ہے:

۱۔ پانچ موذی: حواسِ خمسہ کے صفاتِ ذمیمہ، ان پر قابو پانا چاہیے

۲۔ سات مستیاں[2]: ذات[1]، وسیلہ[2]، خوب صورتی[3]، علم[4]، ہنر[5]، دولت[6]، بادشاہی[7] ان کو فنا ہے، اور آٹھویں مستی اللہ کے یاد کی ہے، اس کو بقا ہے۔ سالک کو چاہیے کہ وہ سات مستیوں کو فنا کرے اور آٹھویں مستی کو فروغ دے۔

۳۔ پانچ جوہر[3]: ایمان، شرم، عقل، کرنی (عمل) صبر، ان کی حفاظت کرے۔

۴۔ پانچ چور: ایمان کا چور حسد، شرم کا چور طمع، عقل کا چور غصہ، کرنی (عمل) کا چور تکبّر، صبر کا چور اوتاولا پن۔ ان چوروں سے چوکس رہنا چاہیے۔

---

۱ے سالک را اول مقام شیطانی است بعد ازاں راہِ شریعت" معرفت السلوک (محمود خوش دہاں)

۲ے مستی کے لیے حب کی اصطلاح بھی استعمال ہوتی ہے۔ ان کی تعداد اور تفصیل میں اختلاف ملتا ہے۔ ملاحظہ ہوں، حضرت امین کے رسائل نثر: وجودیہ، گفتار شاہ امین وغیرہ اور راقم الحروف کی تصنیف، سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ۔ حیات اور کارنامے،

۳ے جوہر کے لیے لعل کی اصطلاح بھی مستعمل ہے۔

۵ - چھ غفلتیں[1]: طمع، تکبّر، غصہ، دہشت، بیماری، پیری، ان پر قابو پانا چاہیے۔

جب سالک نفسِ امارہ کے دیو کو زیر کرتا ہے، صفاتِ ذمیمہ سے مجرد ہوتا ہے، صفاتِ ستودہ کو اپناتا ہے، فہم قیاس سے خدا کو پہچانتا ہے، توحید اقوالی اختیار کرتا ہے تجرید و تفرید کی شرطوں کو پورا کرتا ہے تو وہ مقامِ شیطانی سے باہر آتا ہے اور راہِ شریعت پر چل پڑتا ہے۔ راہِ شریعت میں ذکرِ جلی ضروری ہے، جس سے منزلِ ناسوت حاصل ہوتی ہے خود فراموشی اور حال لازمۂ منزلِ ناسوت ہے۔ یہ کیفیت شہادتِ مبدا کے بغیر دور نہیں ہوتی اور جب دور ہوتی ہے تو وہ واجب الوجود سے مرتبۂ ممکن الوجود میں داخل ہوتا ہے۔

شاہ معظم نے ممکن الوجود، ممتنع الوجود اور عارف الوجود کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے، صرف اتنا کہا ہے:

اول چار تن سو گزرنا کتے ❊ شہادت یو تو حق سو پانا کتے

اس لیے متذکرہ بالا وجودوں کی تفصیل دیا گئے بغیر صرف اسی شعر کی وضاحت کی جاتی ہے: سالک واجب الوجود سے ممکن الوجود کے مرتبے میں، ممکن الوجود سے ممتنع الوجود کے مرتبے میں اور ممتنع الوجود سے عارف الوجود کے مرتبے میں داخل ہوتا ہے اور عارف الوجود کی راہِ معرفت اور منزلِ لاہوت سے گزرنے کے بعد شہادت شہدا اختیار کرتا ہے۔ یہ شہادت عارف الوجود کے چھوڑنے اور قربِ احدیت ذات کے لیے لازم ہے۔ شہادت شہدا کے بعد تمام مراحل مکمل ہو جاتے ہیں اور سالک کے لیے سعی و جہد کی گنجائش نہیں رہتی۔ وہ کامل تو ہو جاتا ہے لیکن مقامِ قرب سے سرفرازی اللہ تعالیٰ کی عنایت پر موقوف ہے۔

بہرحال منازل و مراتب طے کرنے اور خلافت و اجازت حاصل کرنے کے بعد مغربی

---

[1] غفلتوں کی تعداد اور تفصیل میں بھی اختلاف ملتا ہے۔ ملاحظہ ہوں، حضرت امین کے رسائل نثر؛ وجودیہ، گفتار شاہ امین وغیرہ اور راقم الحروف کی تصنیف، سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ حیات اور کارنامے،



سفر پر روانہ ہوئے۔ دورانِ سفر ان کی ملاقات خضر علیہ السلام سے ہوئی، جنھوں نے اُنھیں خلافت و ولایت کی مبارک باد دی، اور شاہ کمال سے ملاقات کا مژدہ سنانے کے بعد کہا کہ وہ تمھارے یار اور غم خوار ثابت ہوں گے، ان پر تمام اسرار منکشف کیجیے اور سفر میں انھیں اپنے ساتھ رکھیے۔

اس واقعے کے کئی دن بعد شاہ کمال سے ملاقات ہوئی۔ مغربی نے اُنھیں اپنے مریدوں میں شامل کیا، تربیت کی اور اپنے رنگ میں رنگ لیا:

کتک دن کو آکر ملے شہ کمال ❊ کرم اُن او پر تب کیے شہ جمال
جمع کر مریدوں میں اُن کو اول ❊ چلے سیر کرتے یو جنگلے جنگل
مرید پیر پر جاں فشانی کیے ❊ الپس کو کتے اس میں فانی کیے
الپس میں اپیں یک دگر ہو ملے ❊ مرید پیر مل یک دگر ہو چلے

پیر اور مرید دونوں نے عرب و عجم کی سیر کی۔ ایک ایک ملک اور ایک ایک شہر کی خاک چھانی اور جگہ جگہ بندہ نواز کی تعلیمات کی تلقین کی۔ اس طویل سفر کے بعد جب وہ گلبرگہ لوٹے تو بندہ نواز کا انتقال ہو چکا تھا۔[1]

سفر پھر کے جب آئے ہیں شہ جمال ❊ شہنشاہ کا تب ہوا تھا وصال

مغربی کے لیے یہ سانحہ ناقابلِ برداشت تھا۔ انھوں نے شاہ کمال کو رشد و ہدایت کا حکم دے کر بیجاپور روانہ کیا اور خود انتقال کر گئے۔[2]

---

[1] بندہ نواز کا انتقال ۸۲۵ھ ہجری میں ہوا، اور انتقال کے وقت ان کی عمر ایک سو پانچ سال چار مہینے بارہ دن تھی (سیرِ محمدی، صفحہ ۳۵)۔

[2] تذکروں میں مغربی کا سنہ وفات نہیں ملتا۔ راقم الحروف کو ان کی تاریخ وفات کے تین مادے ملے ہیں: زاہد پاک جمال چشتی (۸۴۲ھ ہجری)، جمال بغدادواصل (۸۰۰ھ ہجری)، ابدالالدنی جناں مشوہ (۸۱۹ھ ہجری)۔ ان کے علاوہ یہ تاریخ بھی ملی ہے:

حسینی کے غم سوں وہ ناتاب لا ٭ سِناپھوٹ جاکر سو پھوٹا ہیا
مرید کو کہے تم خلافت کرو ٭ بیجاپور تم (جا) ہدایت کرو
اتاراوز عالم پہ کھولو تمیں ٭ شہنشہ کی بات بولو تمیں
مرید کے اوپر یو ھوے کلام ٭ وداع ہو چلے شاہ دارالسلام

شاہ کمال بیجاپور روانہ ہوے اور انھوں نے بہت جلد اہلِ بیجاپور کے دلوں کو مسخر کرلیا:

ادھی وضع دکھن میں رہتے اتھے ٭ ہدایت او دو عالم کو کرتے اتھے
ہوا خلق دکھن میں سب سرفراز ٭ تصدق سوں ان کے کھلا سب پہ راز
نبی کے مجالس میں جاتے اتھے ٭ ملاکو ولایت دلاتے اتھے
کتے سب یو دکھن نے پایا شرف ٭ ہوا غلغلہ سب یو چاروطرف

اس کے بعد میراں جی شمس العشاق کا ذکر ہے۔

کہتے ہیں کہ ایک حاجی مدینۂ منورہ میں قیام پذیر تھے[50]۔ ان کا نام

---

(باقی سلسلہ صفحہ ۱۵۷) دہم ماہِ رجب وفاتِ حضرتِ مغربی قدس اللہ سرہ، شب جمعہ ۷۸۶ھ ہجری کی توثیق حسب ذیل اشعار سے ہوتی ہے،

ریاضت میں کامل اتھے مغربی ٭ خدا سات واصل اتھے مغربی
رجب کا تھا مہینا اور جمعہ کی رات ٭ ہوا ہے سو دسویں کوں ان کا وفات
اتھے سات سو یو اسی چھ برس ٭ زمانے ستے گم ہوا یو برس

کسی قوی شہادت کی عدم موجودگی میں ان میں سے کسی سنہ کو قبول نہیں کیا جاسکتا۔

[50] میراں جی کے مولد و منشا کے بارے میں اختلافِ رائے ہے۔ خود نوشت میں لکھا ہے کہ ان کا آبائی مکان محلہ قریشیہ میں ابی بکر بن قحافہ بن مبارک کے گھر کے برابر تھا۔ ان کے والد نے ہندستان کے ایک چنطبہ خاندان میں بیاہ کیا اور وطن لوٹ گئے، میراں جی مکے ہی میں پیدا ہوئے (خود نوشت مخطوطہ ۸۶۳-ادارہ ادبیات اردو) تذکروں میں کہیں صراحتاً اور کہیں اشارتاً ان کا مقام پیدائش بیجاپور بتایا گیا ہے۔ مولوی عبدالحق نے رسالۂ اردو بابت



میراں[51] جی تھا۔ میراں جی کی دلی خواہش تھی کہ رسول کریم کو اس عالم میں دیکھیں۔ وہ بارہ[52] سال تک، حرم[53] نبوی کی سیڑھیوں پر مقیم رہے۔ اس پورے عرصے میں ایک ہی پہلو پر سوتے تھے۔ جس کی وجہ سے ان کے سارے جسم کو دیمک[54] چاٹ گئی تھی۔ ایک رات انھوں نے رسول کریم کو خواب میں دیکھا، صحابۂ کرام بھی ساتھ تھے، میراں جی نے اپنا مدعا بیان کیا تو رسول کریم نے، حضرت علی سے کہا کہ انھیں بیعت سے سرفراز کریں۔ چناں چہ حکم نبی کی متابعت

---

(باقی سلسلہ صفحہ ۱۵۸ سے) اپریل ۱۹۲۷ء میں اشارتاً مقام پیدائش بیجاپور بتایا ہے، لیکن اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام میں مولد مکہ معظمہ اور رسالۂ اردو بابت اکتوبر ۱۹۳۹ء میں گجرات لکھا ہے۔ پروفیسر سروری عبدالحق کی دوسری رائے سے متفق معلوم ہوتے ہیں (اردو مثنوی کا ارتقا صفحہ ۳۰) ڈاکٹر زور اور پروفیسر نذیر احمد کی رائے ہے کہ علوم متداولہ کی تکمیل کے بعد زیارتِ حرمین کو گئے (دکنی ادب کی تاریخ صفحہ ۲۲، علی گڑھ تاریخ ادب صفحہ ۲۰۹) مہدی علی مرید ثانی امین الدین علی کا بیان ان سب سے مختلف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "اصل ایشاں از نجف اشرف است (بحرالخیال)...

[51] خود نوشت میں نام، امیر الدین المعروف میراں جی لکھا ہے۔ مسافر نے شجرۂ منظوم میں بھی یہی نام لکھا ہے۔ (مخطوطہ، کتب خانہ گچی محل)۔ صاحب انوار الاخیار نے شمس الدین بتایا ہے۔ (مخطوطہ، مملوکہ راقم الحروف) اور بعض شجروں میں بھی یہ نام ملتا ہے۔

[52] خود نوشت میں بارہ سال، تین ماہ اور پانچ دن، روضۃ الاولیا (مخطوطہ ۲۶۶، کتب خانہ آصفیہ) میں پہلے "مدت دراز" اور پھر "دوازدہ سال"، سراج العشق (مخطوطہ ۹۰، تصوف، کتب خانۂ سالار جنگ) میں "چندیں سال"، مثنوی حالی (کتب خانہ درگاہ امین) اور بحرالخیال، میں "شش سال"، مشکوٰۃ النبوۃ (مخطوطہ ۱۹۴، کتب خانہ آصفیہ) اور تذکرۃ القادری (مخطوطہ ۱۰۸۶، کتب خانہ آصفیہ) میں "چندے"، محبوب ذی المنن میں ایک جگہ "چند مدت" اور دوسری جگہ "بارہ برس" لکھا ہے۔

[53] خود نوشت اور تذکروں کے برخلاف مہدی علی کا بیان ہے کہ میراں جی روضۂ امیر المومنین اسد اللہ الغالب کے روبرو مقیم رہے۔

[54] یہ بیان مبالغہ آمیز ہے اور کسی تذکرے میں نہیں ملتا۔

میں حضرت علی نے انھیں بیعت و خلافت سے نوازا:[1]

نبی رحم کر کر کہے یا علی ٭ کروان کو بیعت خدا کے ولی
نبی کے امر سوں یو بیعت کیے ٭ خلافت کی اس ٹھار خلعت دیے

اس کے بعد رسول کریم نے میراں جی سے کہا کہ تم بیجاپور[2] جاؤ۔ وہاں ایک شہر شاہ پور ہے، جو میرے نور سے معمور ہے۔ شاہ پور میں ایک ٹیلا ہے، جو دور سے دکھائی دیتا ہے، وہیں تم سے ظاہر میں ملوں گا۔ وہاں لوگ مجھے شاہ کمال کہتے ہیں:

نبی نے کہے اب تو پایا شرف ٭ ولے جا اتا تو بیجاپور طرف
دہاں ٹیک دستا ہے یک دور سوں ٭ چمکتا ہے روشن مرے نور سوں
ادھی ٹھار ظاہر ملوں گا تجھے ٭ ولے کیوں سمج تو سکے گا مجے
وہاں لوگ کہتے ہیں مجھ شہ کمال[3] ٭ اتا یاد رکھ خوب میرا جمال

---

[1] خود نوشت کا بیان ہے کہ "سید الانبیا دست ایں فقیر گرفتہ بدستِ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سپردند۔ از حضرت اسد اللہ الغالب نعمتِ بیکراں عطا یافتم"۔ مشکوٰۃ اور روضۃ الاولیا میں اس کا ذکر نہیں ہے، مشکوٰۃ میں لکھا ہے "..... بعد ازاں شیخ حرم در رویا نمودند کہ آنحضرت علیہ السلام می فرمایند کہ میراں جی را علمے از سلح خانۂ مادہ و حضرت ایشاں را در معاملۂ صادقہ فرمودند: اے فرزند علم از شیخ الحرم گرفتہ متوجہ بہ طرفِ دکن (روانہ) شو کہ نعمتِ تو در انجا مقسوم یافتہ و بجاے کہ ایں علم بر زمین آید زمینہ جاے سکونت و مدفن تو است۔ پس علی الصباح حضرتِ ایشاں بہ شیخ ملاقی شدہ علمِ غالب را گرفتہ بہ طرفِ دکن راہی شدند"، اور روضۃ الاولیا کا بیان ہے "گویند مدتِ دوازدہ سال ملازم آستانۂ نبوی بر یک پہلوی خسپیدو بہ اشارۂ جناب رسالت مآب صلوات اللہ علیہ رختِ اقامت از انجاے محترم برچیدہ رخِ عزیمت بہ دکن آوردہ"۔

[2] خود نوشت میں "ہند" روضۃ الاولیا اور مشکوٰۃ میں "دکن" لکھا ہے۔ البتہ مثنوی حالی اور بحر الخیال میں "شاہ پور" ہے۔

[3] مخطوطہ میں شاہ جمال ہے۔



میراں جی بڑے ذوق و شوق کے ساتھ دکھن روانہ ہوئے۔ شاہ پور میں اسی ٹیلے پر، جس کی نشان وہی رسول کریم نے خواب میں کی تھی، شاہ کمال کو دیکھا اور پہچان گئے[1] شاہ کمال نے انھیں سینے سے لگا لیا۔ اسی دن حق عرفان اور فقد عرفان کے اسرار سے واقف کرایا، تمام منازل اور مراحل طے کرائے، بندہ نواز سے ملایا۔ رسول کریم کی مجلس میں لے گئے، اور حضرت علی کے ہاتھ میں ان کا ہاتھ دیا، خلافت عطا کی، شمس[2] العشاق کے لقب

---

[1] سید علی پیر کا بیان ہے کہ میراں جی پہلے شاہ کمال الدین بیابانی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پھر وہاں سے شاہ پور آئے، انھوں نے اس مقام کا ذکر نہیں کیا ہے، جہاں دونوں کی ملاقات ہوئی لیکن اندازِ بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی ملاقات شاہ پور میں نہیں بلکہ کسی اور جگہ ہوئی، ہوسکتا ہے کہ یہ مقام گلبرگہ ہو:

بہ نزدِ شہ کمال الدین رسیدہ ٭ کہ نعمت ظاہری از وے چشیدہ
ازاں جا آمدہ آں شاہ شہ پور ٭ ظہوری شد ہموں بود ہموں نور

(سراج العشق)

خود نوشت سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے: "برحکم معالی بہ ہند آمدم، در خدمت شاہ کمال الدین رسیدم و چند ایام سعادت انجام خدمت کردم ...... برحکم پیر ایں فقیر در بھنگار کہ خدائی کردہ چند روز ماندہ در خدمتِ پیر آمدم۔ فرمودند کہ حکم نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام شدہ است کہ بہ بیجاپور بروند و جاے کہ اشارۃ نبی اللہ شود در ایں جا مستقیم و ساکن باشند"۔ مہدی علی نے صراحتاً مقامِ ملاقات گلبرگہ بتایا ہے: "...... قصد دکھن نمودند۔ چناں چہ منزل در منزل در دیار گلبرگہ تشریف رسیدند و در آں مابین حضرت خواجہ کمال الدین بیابانی قدس اللہ سرہ العزیز در راہ ملاقات کردند ...... از انجا موجب حکم حضرت امیر المومنین اسد اللہ الغالب علیہ الصلوٰت والسلام بہ شاہ پور (رخصت شد) عزم فرمودند چناں کہ بعد از رسیدند (کذا) انجا یک پشتۂ کوہی بر آں استقامت ورزیدند ......" (بحر الخیال)

[2] سید علی پیر کی بہ موجب یہ لقب عطاے رسول ہے۔ (سراج العشق) اور مہدی علی کے بیان کی بہ موجب عطاے حضرت علی ہے (بحر الخیال)

سے سرفراز کیا اور بیجاپور میں رشد و ہدایت کا منصب تفویض کیا۔ پھر کدخدائی کا حکم دیا اور بشارت دی کہ تم کو کئی اولاد ہوگی اور اُن سے تمھارا سلسلہ جاری رہے گا۔ پہلا لڑکا بہت جلد ہوگا، جو بڑا قطب اقطاب ہوگا۔ لوح پر اس کا نام برہان لکھا ہے اور ملایک اس کو ظل سبحان کہتے ہیں۔ اس پر تمام اسرار منکشف ہوں گے اور خاص و عام اس کی پرستش کریں گے۔ خانوادۂ چشت میں اس کا بڑا نام ہوگا۔ ہمیں تمھارا بڑا انتظار تھا، تم کو دیکھ لیا، اب تمھارے فرزند کو دیکھنے کی آرزو رہ گئی ہے۔

جب تمام مراحل طے ہوگئے تو شاہ کمال نے میراں جی کو آگاہ کیا کہ انھیں اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا ہے کہ سفر اختیار کریں اور فاتحہ پڑھ کر اسی دن شاہ پور سے روانہ ہوگئے۔

میراں جی نے اسی ٹیلے پر سکونت اختیار کی، جس کی ان کو بشارت دی گئی تھی۔ لوگ جوق در جوق آنے اور ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہونے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ایک شہر بس گیا۔ اُن کی شہرت ملک میں دور دور تک پھیل گئی۔ جو کوئی ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوتا وہ فاضل اور واصل کے مقام پر پہنچ جاتا۔ غرض وہ ایک مدت تک "باطن کے دیس" کی بادشاہی کرتے اور خلقِ خدا کی ہدایت کرتے رہے:

میراں جی کو حق وانچہ روشن کیا ٭ اُسی ٹیک کو حق نے گلشن کیا
وہی ٹیک پر جب ہوا ہے نشر ٭ اُسی ٹھار آکر بسا ہے شہر
دیکھے خلق حق پر یو مشتاق ہے ٭ یو برحق کہے شمس عشاق ہے
ہوا غلغلا سب یو چارو طرف ٭ جکوئی آملیا سو او پایا شرف
اول غل اوٹھا ہے کتے شہر ہیں ٭ نشر تب ہوا ملک اور دہر میں
اتھا علم ظاہر تو اُن پر تمام ٭ ہوا علم مکشوف باطن تمام
بہت خلق کو شاہ ہدایت کیے ٭ بہت خلق کو راز نعمت دیے
کیے سب پہ اظہار باطن کے راز ٭ امر جیوں کیے تھے وہ بندہ نواز



جکوئی آملا سو وہ کومل ہوا ٭ او فاضل ہوا اور واصل ہوا
کتے دیس باطن کی شاہی کیے ٭ امر جیوں ہے تیوں راہ نمائی کیے

میراں جی نے رسول اور پیر کے حکم کی متابعت میں شادی کی[1] اور ان کے گھر لڑکا پیدا ہوا۔ جس کا نام برہان رکھا گیا۔ جب لڑکے کی عمر پندرہ سال ہوئی تو اس پر "چھپے قال" کا شوق غالب ہوا۔ میراں جی نے بیٹے کو مرید کیا اور سفر پر روانہ ہونے کا حکم دیا، اس لیے کہ

بجز رنج کوئی گنج پایا نہیں ٭ سو محنت بجز بار نایا نہیں

سفر میں شاہ برہان نے کئی نعمتیں پائیں اور تین سال بعد گھر لوٹ آئے، میراں جی نے ان کی تعلیم و تربیت مکمل کی، خلافت عطا کی اور اپنا جانشین بنا کر اس دنیا سے کوچ کیا۔

معظم شاہ برہان کی توصیف میں کہتے ہیں:

اتا صفت کرتا ہوں برہان کا ٭ او برحق دسا ظل سبحان کا
او حنان ہے اور منان ہے ٭ او دیان ہے اور برہان ہے
یو کعبہ دسا توجہ برحق کتے ٭ خدا کا اُسے بیت مطلق کتے
جکوئی آملا سو وہ حاجی ہوا ٭ وہ عالم منے سیچ او ناجی ہوا
ہوا راز اظہار برہان سوں ٭ جواہر تپیچتے ہیں جیوں کھان سوں
مکمل ولی شیر یزداں ہوا ٭ جلالت بھرا سیف برہاں ہوا
دیا حق نے باطن کی دولت اُسے ٭ یو عصمت، سکت اور کرامت اُسے
اول تو شریعت کو دے کر رواج ٭ طریقت اُنو کا اتھا سچ مزاج

---

[1] برحکم پیر ایں فقیر در بھنگار کدخدائی کردہ چند ماہ ماندہ، در خدمت پیر آمدم، خود نوشتہ مخطوطہ ۸۶۳، ادارہ ادبیات اردو۔

حقیقت او نو پر تو احوال تھا ٭ دیکھو معرفت کا یو سب قال تھا
اول رکھ مریداں کو ناسوت میں ٭ لیجاویں کتے ان کو ملکوت میں
سو جبروت میں اُن کو کر مستقیم ٭ ولاتے ہیں اس ٹھار خلعت عظیم
سو بعد از لیجا اس کو لاہوت میں ٭ سو لاہوت میں اور ہاہوت میں

معظم کہتے ہیں کہ شاہ برہان کے چار خلفا[۵] تھے، خلفا کے خلفا کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی تھی اور مرید تو بے شمار تھے۔

نبی سوں لیجاکر ملاتے تھے او ٭ ملاکر ولایت ولاتے تھے او
او کیا زیب دیتے تھے من عرف کو ٭ دیکھاتے اتھے میم کے حرف کو
مریداں دیکھو شاہ کے خوب ہیں ٭ ایکس سو دیکھو ایک محبوب ہیں
خدا کے چھپے راز کے جام کو ٭ پلاتے ہیں سب خاص اور عام کو
یو پند آپنا جب او کرتے ہیں واز ٭ یو خادم ہو مخدوم تو سرفراز

شاہ برہان نے تصنیف و تالیف پر بھی توجہ دی اور اِن تصانیف کے ذریعے دُور دُور تک اُن کی تعلیمات پہنچیں:

کتاباں ہوے[۶] اور چلا یہ کام ٭ بلخ اور بخارا یو سب روم و شام

شاہ برہان کو جب یہ معلوم ہوا کہ اُن کی بیوی امید سے ہیں تو اُن کو بڑی خوشی ہوئی، اپنی اس خوشی میں مریدوں کو شریک کرنے کے لیے انھوں نے یہ خبر سب کو سنائی اور ہونے والے بچے (امین) کے اوصاف بیان کیے:

---

۵ راقم الحروف کو ان کے اکیس خلفا کا پتا چلا ہے۔ ملاحظہ ہو: سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ۔ حیات اور کارنامے، صفحہ ۱۰۸ اور صفحہ ۶۲۳

۶ ہدی علی کا بیان ہے: تصانیفِ آں حضرت (جانم) نیز پنج شش جلد است (بحر الخیال)، اور صاحب مشکوٰۃ لکھتا ہے: چند رسائل در علمِ معرفت الٰہی از تصانیف اوست۔



سُنے[۱] گھر میں امید ہے شاہ نے ٭ کیے لیچ شادی سو جم جاہ نے
اُسی روز شہ نے دیے سب خبر ٭ صفت سب امیں کی کہے کھول کر
خدا کا کہے شیر آتا ہے یو ٭ برابر چھپے گنج لاتا ہے یو

اس خوشی خبری کے ساتھ یہ اندوہ ناک خبر بھی سنائی کہ اُن کا وقت موعود آن پہنچا، ایک جنگل میں دو شیر نہیں رہ سکتے اور ایک نیام میں دو تلواریں نہیں سما سکتیں:

کہے اب طلب مجہ کیا ہے حضور ٭ اتا مجہ کو جانا ہوا لا ضرور
نہ یک ٹھار دو مل کے رہتے پلنگ ٭ نہ یک میان میں دو سماتے فرنگ
کہے سر اوپر ہے تمھارے خدا ٭ ہمیں اب تمھارے سوں ہوتے وداع

اس کے بعد اپنے نامور خلیفہ سید صاحب گھر (سید علی گنج گوہر) کو مخاطب کر کے کہا: امین کو ہمارا اسلام کہنا اور ان کو تمام اسرار و رموز سے واقف کرانا۔[۲] پھر حضرت امین

---

۱ حضرت امین کی ولادت سے متعلق روایات و کرامات پر مشتمل ایک مثنوی امین نامہ ہے، جس کے مصنف خداوند شاہ ہیں۔ اس مثنوی کے بیان کے مطابق بندہ نواز نے جانم کو عالمِ رویا میں حضرت امین کی ولادت کی بشارت دی تھی اور ان کے اوصاف بیان کیے تھے:

حسینی کہے شاہ برہان دیں ٭ ترے پیٹ میں ہے یو حضرت امیں
تمیں ان کو جانو ولی العظیم ٭ ہمیں جس کوں بخشے دکھن کی زمیں

اس بشارت سے جانم نے اپنے مریدوں کو مطلع کیا (امین نامہ، مخطوطہ کتب خانہ درگاہ امین، بیجاپور)

۲ امین نامے کا بھی کم و بیش یہی بیان ہے لیکن صاحبِ مجمع الانساب لکھتا ہے: "چوں وقتِ رحلتِ شاہ برہان الدین صاحب عن قریب رسید محمود خوش دہاں و خداوند خدانما را طلب فرمودند۔ ہر دو صاحبان از بیدر بہ بیجاپور تشریف آوردند و از ایشان نعمتِ قادریہ اخذ فرمودند و نعمت چشتیہ بہ ایشاں عطا نمودند۔ بہ خداوند خدانما وصیت فرمودند کہ ایں نعمتِ خاندان چشتیہ کہ شما را عطا نمودہ ام ایں امانتِ فرزندم شاہ امین الدین کہ عن قریب ظہور اوست بہ رسانند و بہ شاہ محمود خوش دہاں وصیت فرمودند کہ صاحب پیر تربیت او باشند (باقی سلسلہ ۲۶ پر)

کے لیے کلاہ اور شجرہ حوالے کیا[۱] اور رحلت کی۔

چند دن بعد حضرت امین پیدا ہوئے[۲]۔ وہ مادر زاد ولی تھے۔ روزِ اول ہی ان کو علم سینہ وسفینہ کی دولت عطا ہو چکی تھی[۳]۔ وہ بڑے ہوئے تو اُن کی شہرت دور دور تک پھیلی اور اُن کے فیضان سے سارا ملک بہرہ ور ہوا۔ شاہ کمال نے اُن کے بارے میں جو بشارت دی تھی، وہ پوری ہوئی۔ جس کسی نے اُن کو قریب سے دیکھا اس کا شمار اولیا اللہ میں ہونے لگا۔

---

(باقی سلسلہ صفحہ ۱۶۵ سے) وآںمی چنیں کہ علوم ظاہری وباطنی باشد مرحمت نمائند۔ پیر ابو محمد کہ برادرِ رضاعی ومریدِ حضرتِ ایشاں بود وصیت فرمودند کہ تربیت دستار وگفتار وقول وفعل ونشست وبرخاست نماید"
(سید محی الدین قادری، مجمع الانساب، مخطوطہ کتب خانہ گچی محل، بیجاپور)
لیکن واقعہ یہ ہے کہ حضرت امین کی تعلیم وتربیت بھی محمود خوش دہاں نے کی تھی اور خانوادہ قادریہ اور چشتیہ میں بیعت وخلافت بھی انھوں نے ہی دی تھی (خلافت نامہ ہا باشاہ حسینی، قلمی، مملوکہ سید امین الدین قادری جاگیردار جمال پور) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ، حیات اور کارنامے، صفحہ ۱۲۰ تا ۱۳۳۔

[۱] صاحبِ مشکوٰۃ لکھتا ہے کہ حضرت امین الدین علی اعلیٰ ہنوز در شکمِ مادر بود کہ شاہ برہان روزے کلاہِ مبارک بر شکم مادرِ ایشاں نہادہ فرمودند کہ امین الدین در شکم تو است، ایں خرقہ امانت اوست، باید بدو رسانی" اور یہ کلاہ حضرت امین نے "از دستِ شاہ عطاء اللہ حسینی کہ عمِ ایشاں بودند پوشیدند" بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ حضرت امین کو بیعت وخلافت بھی شاہ عطاء اللہ حسینی سے حاصل تھی (روضۃ الاولیا، بحرالخیال) لیکن یہ درست نہیں ہے

[۲] مہدی علی کا بیان ہے کہ شاہ برہان نے یہ وصیت کی تھی کہ بعد از رحلتِ من فرزندے کہ پیدا می شود آنرا آوردہ تا چہل روز درونِ غلافِ مرقدِ من بخوابانید وبعد از چہل روز خبرش بگیرید"۔ اور ایسا ہی کیا گیا لیکن پچیس[۲۵] دن بعد جب اُن کی ماں بے چین ہو گئیں تو بچے کو گھر لایا گیا (بحرالخیال)

[۳] مشکوٰۃ میں لکھا ہے کہ جانم نے اپنے خلفا سے کہا تھا: اورا (حضرت امین) علم ظاہر بنود اما رسا لہائے دکھنی پیشِ او چناں خواندہ باشید کہ سمع او رسیدہ باشید۔



معظم، حضرت امین کے تربیت یافتہ تھے، اس لیے بڑے پیار اور مان سے اُن کا ذکر کرتے ہیں:

دنیا میں کیتک دن کو آیا امیں ⁂ برابر چھپے گنج لایا امیں
اُسی ٹیبنک پر چاند بالا ہوا ⁂ دنیا دین میں سب اُجالا ہوا
ہوا غلغلا ملک میں شاہ کا ⁂ اُجالا پڑا اُس پہ اِس ماہ کا
ازل سوں اُسے حق یو دولت دیا ⁂ ولایت کی خلعت عنایت کیا
اول سوں اُسے راز کا علم تھا ⁂ ازل سوں اُسے علم اور حلم تھا
اول سونچہ بولے اتھے شاہ کمال ⁂ امیں ہوے گا ایک صاحب جمال
اُسے خوب دیکھا سو ہوگا ولی ⁂ اُسے کشف ہوگا خفی او جلی
اُسی وضع سوں دیکھ عالم تمام ⁂ اُسی وضع سو داز کر خاص وعام
نوازا گدا کئی مرے سار کے ⁂ کیا بادشاہ اُن کو اسرار کے
نظر بھر امیں کو سو دیکھا ہوں میں ⁂ سدا ذات میں غرق پیکھا ہوں میں
سدا کیف میں مست ماتے اتھے ⁂ سدا عشق میں حق کے راتے اتھے
پلک عشق کا نیچہ کھولے کبھی ⁂ بجز راز نیں بات بولے کبھی
غوطہ کھا کے وحدت کیے دریا منے ⁂ اولائے سو تھے گوہر ان گنے
اسی کام میں شاہ مشغول تھے ⁂ اسی کام سوں حق کے مقبول تھے
زمانے کے شاہاں پرستش کریں ⁂ جلکچہ مال دھن لا کے آگے دھریں
حضوری منے حق کے وہ غرق تھے ⁂ وصل سوں کبھی نیچہ وہ فرق تھے
وہ ظاہر تو لئی مست سرشار تھے ⁂ ولیکن او باطن میں ہوشیار تھے

معظم نے حضرت امین کی دو کرامتیں بیان کی ہیں:
حضرت امین کے ہاں ایک سنیاسی آیا۔ وہ اداسی تھا۔ اس نے حضرت امین کو پارس

نذر کیا، لیکن انھوں نے اس کو شاہ پور کے تالاب میں پھینک دیا۔ سنیاسی کو بڑا دکھ ہوا اور وہ رونے لگا۔ حضرت امین پہلے تو مسکرائے پھر اس سے کہا: جاؤ تالاب میں سے اپنا پتھر نکال لاؤ۔ وہ گیا اور فوراً پتھر نکال لایا۔ اس واقعے سے وہ اتنا متاثر ہوا کہ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوگیا۔

ملاشہ سوں ایک سنیاسی کتے ؛ سنیاسیوں میں تھا وہ اداسی کتے
امیں کو اُنے لاکے پارس دیا ؛ لوہے کو لگا تو چہ سُنّا کیا
کہا لیچہ محنت سوں پایا ہوں میں ؛ تمھارے لیے توچہ لایا ہوں میں
لیے سو سٹے شہ نے غرقاب میں ؛ سو شہ پور کے دیکھ تالاب میں
ہے مشہور یو بات سب دہر میں ؛ ہر یک ملک میں اور ہر یک شہر میں
اد پارس سٹے کر کے زاری کیا ؛ سنیاسی نے جب اپنی خواری کیا
او سے دیکھ کر شہ تبسم کیے ؛ سنیاسی کو بعد از امریوں دیے
کہے شہ جا دیک پانی بھتر ؛ وہاں دیکہ کر لے تو اپنا پھتر
اوسی وضع سوں بیٹھ پانی منے ؛ کیتک دیک پایا ہے پارس اُنے
دیکھا کشف شاہ کا ہوا معتقید ؛ کلیمہ کہا اور ہوا ہے مرید

دوسری کرامت وہ ہے جو عام طور پر تھوڑے بہت فرق کے ساتھ تذکروں میں ملتی ہے[1]۔ سید بخاری[2] نام ایک بزرگ حافظ، قاری اور صاحب شریعت تھے۔ انھوں نے حضرت امین کو کہلا بھیجا کہ آپ عبادت سے کیوں غفلت برتتے ہیں۔ آئیے آپ اور ہم مل کر نماز جمعہ ادا کریں۔ حضرت امین نے جواب میں کہلوایا کہ دیر نہ کیجیے۔ فوراً چلے آئیے، اور خود تالاب پر مصلیٰ بچھا کر نماز کے لیے کھڑے ہوگئے۔ سید بخاری نے یہ

---

[1] مشکوٰۃ النبوۃ، روضۃ الاولیا و تذکرۃ القادری
[2] سید محمد بخاری صاحب علی باغ جو اس عہد کے جامع شریعت و طریقت بزرگ تھے، اور سلاطین و امرا کے ہاں بھی ان کی بڑی قدر و منزلت تھی۔



منظر دیکھا تو اوسان خطا ہو گئے اور سوچنے لگے کہ یہ کیا مصیبت آن کھڑی ہوئی۔

یہ واقعہ شہر اور شہر کے باہر دور دور تک مشہور ہوا۔

اس واقعے کے بعد حضرت امین نے اپنے خلیفہ سید خداوند کو طلب کیا۔ اور ان کے ذریعے سید محمد بخاری کو اپنا پیام بھیجا، جس میں شریعت اور طریقت کے بارے میں اپنے مسلک کی وضاحت کی ہے۔

معظم، سید خداوند کے بارے میں لکھتے ہیں:

امیں کے مقرب اتھے یک فقیر ؛ اتھا علم تحصیل، روشن ضمیر
خلیفوں منے او اتھے بہرور ؛ او سید خداوند تھے نامور
ہر یک علم میں خوب قابل اتھے ؛ او فاضل اتھے اور واصل اتھے
لدنی کتے علم اظہار تھا ؛ کتے حال اور قال سب بار تھا
مریداں اتھے اُن کے کئی حق رسید ؛ او دیکھے اتھے حق کو حبل الورید
ہر یک بات میں خوب طرار تھے ؛ او ہر یک مجالس میں درکار تھے

سید خداوند کے ذریعے حضرت امین نے جو پیام بھیجا، وہ یہ ہے:

شریعت اوپر یونچہ قایل رہنا ؛ چھپے راز پر یونچہ مایل رہنا
نبی نے احادیث میں یوں کہے ؛ عبادت کتے دو وجہ کا اہے
عبادت ہے ظاہر کی صوم و صلوٰۃ ؛ سمجھنا ہے باطن میں ذات و صفات
بندہ کس کو کہتے سمجھنا اول ؛ کھڑے گا او سے توجہ حق کا وصل
نبی نے دیکھو کھول کر سب کہے ؛ عبادت خدا کا تو نوعان ہے(؟)
کتے یک حقیقت ہے دسرا مجاز ؛ ولیاں کا ہے باطن میں روزہ نماز
شریعت پہ قائم ہے، زاہد کتے ؛ کریں تن سوں بندگی سو عابد کتے
طریقت برتتے سو عارف ہیں جان ؛ حقیقت پہ مائل سو عاشق ہے مان

کھلا معرفت او چہ واصل ہوے ٭ وو واصل ہوے اور کامل ہوے
ہمیں یوں کرتے ہیں روزہ نماز ٭ سمجھتے ہیں حق کا یو راز و نیاز
عبادت تو ظاہر کی یہ فرض ہے ٭ خدا کا یہاں دیکھنا فرض ہے
اول تو سمجھنا ہے یہ بات کو ٭ تو سمجھے گا سچ حق کی وہ ذات کو
امریوں کیے ہیں وہ حق کے رسول ٭ امر سب نبی کا کیے ہیں قبول
شریعت بجز راہ دستا نہیں ٭ شریعت بجز باٹ بستا نہیں
شریعت زمیں کر سو بولے رسول ٭ امت پر یہ سب راز کھولے رسول
طریقت نبی نے کہے ہیں شجر ٭ حقیقت سو اس کو لگا ہے ثمر
کہے معرفت اس کی لذت کتیں ٭ انپڑتے ہیں واصل سو دولت کتیں
شریعت نبی نے کہے رات ہے ٭ اندر گرد جیوں کہ ظلمات ہے
طریقت نبی نے ستارے کہے ٭ وسلے کچھ بھی دستے ہیں تارے کتے
حقیقت سو جیوں چاند اور چاندنا ٭ چکور ہو کے عاشق نے دل باندنا
دیکھو معرفت کو کہے آفتاب ٭ چھپا راز اظہار ہوتا شتاب
شریعت ہے کشتی نبی نے کہے ٭ ہوا سار (سوار) سو وہ سلامت رہے
طریقت کو دریا ہے کر جاننا ٭ جواہر میں بھرپور کر ماننا
حقیقت صدف کر کہے ہیں رسول ٭ او سے ہات لینے سے ہوتا وصول
کہے معرفت ذات ہوتی ہے جوں ٭ او سے عاشقاں ہات لیتے ہیں یوں
شریعت نبی نے کہے قال ہے ٭ طریقت مرا سب یو افعال ہے
حقیقت ہے احوال مجہ پر مدام ٭ دیکھو معرفت ذات سب ہے تمام
بجز یوں چلے ہاسے پاتا نہیں ٭ بجز راہ کچھ ہات آتا نہیں

حضرت امین کے اس پیام سے سید محمد بخاری بہت متاثر ہوے اور ان کی



تعلیمات کو قبول کر لیا۔ عام لوگوں میں اس واقعے کا چرچا ہوا تو وہ بڑی تعداد میں حضرت امین کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے اور ان کی ولایت کو ہر ایک تسلیم کرنے لگا۔ اب ان کے دایرۂ اثر میں صرف مسلمان ہی نہیں تھے، ہندو بھی تھے[5] جو بقول معظم کئی لاکھ کی تعداد میں مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے؛

---

5۔ حضرت امین کے حلقۂ ارادت میں ہندو بھی یقیناً شامل ہوں گے، لیکن ان کے بارے ہم تک کوئی معلومات نہیں پہنچ سکی ہیں۔ راقم الحروف کو ان کے صرف ایک ارادت مند کا پتا چل سکا ہے، جن کا نام چنّا ویرا تھا۔ حضرت امین نے انھیں فقیر سوامی کا نام دیا تھا اور وہ اسی نام سے مشہور ہوے انھیں فقیر شاہ بھی کہا جاتا ہے۔ حضرت امین ہی نے ان کی پرورش اور تربیت کی تھی۔ ان کا مٹھ سرہٹی میں ہے جو گدگ کے جنوب مشرق میں بارہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ فقیر سوامی کے موجودہ جانشین سدرام سوامی ہیں، جو ۶ نومبر ۱۹۶۹ء کو اس منصب پر فائز ہوے۔ یہ اس سلسلے کے دسویں سوامی ہیں۔ یہاں یہ طریقہ اب تک رائج ہے کہ جانشین پہلے حضرت امین کے سلسلۂ ارادت میں شامل ہوتا ہے اور فقیری کی تمام رسومات ادا کی جاتی ہیں، پھر شام میں ہندوؤں کے مخصوص طریقوں سے جانشینی کی رسم ادا ہوتی ہے۔ حال حال تک حضرت امین کے سجادے سوامی کو نقرلے حضرت امین میں شامل کرنے کے لیے بیجاپور سے آیا کرتے تھے، لیکن اب یہ رسم منجلے پور والے ادا کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ نقار خانے میں ہر جمعرات کو حضرت امین کی فاتحہ ہوتی ہے۔ نقار خانے کی تعمیر میں اسلامی خصوصیات ملتی ہیں۔ پہلے اور آخری مینار پر چاند بنے ہوے ہیں۔ سب سے دلچسپ چیز یہ دیکھنے میں آئی کہ میرے سوامی کی سمادھی کے دروازے کے اوپر نادِ علی کندہ ہے۔ ممکن ہے ان سے پہلے اور بعد کے سوامیوں کے سمادھیوں کے دروازوں پر بھی نادِ علی کندہ ہو جو امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں باقی نہ رہی ہو۔

کہتے ہیں کہ امین اپپا، جنھیں مون اپپا بھی کہتے ہیں، نامی ایک اور ہندو بزرگ حضرت امین کے فیض یافتہ تھے۔ اُن کا مٹھ منتنی میں واقع ہے۔ راقم الحروف نے یہ مٹھ نہیں دیکھا۔

یہی بات سن کر سو اہلِ ہنود ٭ کتک لاک عالم کیا آسجود
کتک لاک دیکھا ہوں زنار دار ٭ امیں کے اوپر آکے ہوتے نثار
کتک لاک جنگم کیا آسجود ٭ کیے آکے تحقیق اپنا وجود
یو میں میں کتا مجہ میں سو کون ہے ٭ او صاحب کو اتا سو وہ کون ہے
پوچھے پر کہے بات یو راز کا ٭ امر جیوں اتھا ان کو شہباز کا
چھپے راز سوں جب او باہر ہوے ٭ کتک لاک کافر سو شاکر ہوے
ہیں دیکھا تماشا یو اپنی نظر ٭ امیں سوں ملا سو ہوا بہرور

حضرت امین کا تذکرہ ختم کرتے ہوئے معظم کہتے ہیں وہ گیارھویں صدی کے ہادی تھے اور ہمارے لیے تو ان کی حیثیت مہدی کی تھی۔ انھیں لوگ مجذوب کہتے تھے لیکن دراصل وہ سالک تھے اور مقام محبوبیت پر فائز تھے:

اگیارا صدی میں یو ہادی ہوا ٭ ہمارے تو حق پر یو مہدی ہوا
ہوا خلق اس بات پر معتقید ٭ خدا کو دیکھاتے ہیں شہ کے مرید
امیں کو کتے خلق مجذوب تھے ٭ او سالک اتھے اور محبوب تھے
ہوا تھا امین سچ یو فانی فی اللہ ٭ رہا تھا امین سچ ہو باقی باللہ

حضرت امین کے بعد ان کے صاحب زادے بابا شاہ حسینی کا ذکر ہے۔

شاہ معظم کہتے ہیں کہ حضرت امین اپنے فرزندِ دل بند کو پیار سے شاہ بابا کہتے تھے اور انھیں بے حد عزیز رکھتے تھے۔[1] وہ حضرت امین ہی کے چہیتے نہ تھے بلکہ ہر ایک ان سے

[1] تذکروں کا بیان ہے کہ جب بھی آپ کے ہاں بچہ پیدا ہوتا، اس کے چہرے پر ہات رکھ کر کہتے: بابا آرام کرو۔ بچے کا اسی وقت انتقال ہو جاتا۔ جب بابا شاہ پیدا ہوئے تو ان کی ماں نے حضرت امین سے اس واقعے کو پوشیدہ رکھا اور ان کی پرورش کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ باباشاہ کی عمر ۱۲ سال ہو گئی۔ ایک دن اتفاقاً باپ بیٹے کا آمنا سامنا ہو گیا۔ ماں حیران و پریشان تھیں کہ دیکھیے اب کیا ہو، اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، حضرت امین نے بیوی سے مخاطب ہو کر کہا: کیوں پریشان ہوتی ہو، یہ بابا حسینی ہیں، خدا اس کی نسل کو تمام اور برقرار رکھے۔ (مشکوٰۃ)



پیار کرتا تھا۔ وہ حق آگاہ تھے، اور عشقِ حقیقی کے نشہ سے سرشار تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں دنیا[1] اور دین دونوں سے سرفراز کیا اور مقامِ قرب سے نوازا تھا۔

حضرت امین نے تعلیم و تربیت کے بعد شاہ بابا کو خلافت عنایت کی اور اپنی مسندِ ارشاد پر بٹھا کر گویا اپنا وارث اور جانشین مقرر کیا۔

امیں کا دیکھو چاند روشن ہوا ٭ زمیں اور زماں سب یو گلشن ہوا
کتے شاہ بابا او سے پیار سوں ٭ امیں کا اتھا پیار دل دار سوں
اول سوں او سے حق نے ماتا کیا ٭ او سے عشق میں اپنے راتا کیا
امیں کا تو بر حق وہ فرزند تھا ٭ ولیکن دو عالم کا دل بند تھا
دنیا دین سب حق دیا تھا او سے ٭ قرب دار حق نے کیا تھا او سے
امیں نے حضور سوں خلافت دیے ٭ مریداں کرو کر اجازت دیے

شاہ بابا کی شادی بھی حضرت امین ہی نے کی تھی:

حضور سوں دیکھو کہ خدائی کیے ٭ او سے تخت اور تاج اپنا دیے

حضرت امین کی زندگی ہی میں شاہ بابا صاحبِ اولاد ہوئے۔ اُن کے بڑے صاحب زادے کا نام حضرت امین ہی نے علی رکھا تھا:

امیں نے کہے نام ان کا علی ٭ او بر حق خدا کا ہوا ہے ولی

حضرت امین اپنے پوتے سے بہت پیار کرتے تھے، اسی پیار کی وجہ سے یہ سونا اکسیر بنا:

امیں کا کتے شاہ پر پیار تھا ٭ امیں کا وہ معصوم دل دار تھا
کھلاتے اتھے پیار سو اس امیں ٭ بلاتے اتھے چاو سوں اس امیں

[1] مہدی علی کا بیان ہے: گویند کہ آنحضرت سہ مرتبہ خانۂ خود را سوزانیدند، می فرمودند کہ جمع اسباب این جہاں اسبابِ جمیعت باطن را پراگندہ می کند (بحر الخیال)

اسی پیار کی دیکھ تاثیر سوں ؛ ہوا دیکھ کنچن یو اکسیر سوں

معظم، علی پیر کا ذکر بڑی محبت اور احترام کے ساتھ کرتے ہیں اور اس قدر عجز و الحاح کے ساتھ اُن سے لطف و کرم کی التجا کرتے ہیں جیسے علی پیر ہی ان کے شیخ ہوں۔

مرے حق پہ والیِ محشر ہے تو ؛ مرے حق پہ ساقیِ کوثر ہے تو
اے ساقی اتا جام دے پیار سوں ؛ اتا مست کر اپنے اسرار سوں
ازل سوں کیا حق نے ساقی تجھے ؛ پلا جام اے شاہ باقی مجھے
ابد لگ رہوں مست ماتا ہو میں ؛ ترے عشق میں مست راتا ہوں میں
پلا کر ایتا مج کو سرشار کر ؛ چھپا راز سب مجہ پہ اظہار کر
ہمیشہ ثنا صفت کرتا رہوں ؛ تری یاد کا دم یو بھرتا رہوں
تصدق ترے مال اور جان کا ؛ مجھے دان دے شاہ ایمان کا

علی پیر کی طرح کے خاتمے پر شاہ معظم کہتے ہیں کہ میں آپ کو عالم شہادت میں علی سمجھتا ہوں لیکن بہ باطن قادر (قادر لنگا کو تال)۔ اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ علی پیر کے زمانۂ رشد و ہدایت سے پہلے ہی شاہ معظم کے شیخ شاہ قادر لنگا کو تال کا وصال ہو چکا تھا۔ اس لیے معظم علی پیر کو حضرت امین کے وارث اور جانشین کی حیثیت سے بے حد عزیز رکھتے تھے اور انھیں بہ یک وقت حضرت امین اور حضرت قادر لنگا کا قائم مقام تصور کرتے تھے۔

آخر میں معظم اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ یہ دنیا ناچیز اور بے وفا ہے۔ اس سے دل لگانے میں سراسر زیاں ہے۔ طالبِ دنیا مخنث اور طالبِ جنت مونث ہوتے ہیں۔ مرد وہی ہے، جو خدا کا طالب ہے۔ اس لیے اے معظم اُٹھ اور ساقی سے جامِ عرفان طلب کر۔ یہ تیری خوش قسمتی ہے کہ تجھے امین جیسا ساقی نصیب ہوا ہے۔

اتا اوٹھ توں ساقی سوں جا کر عرض ؛ اگر ہے حشر کا تجھے یو غرض



اتا جام دیتا ہے آبِ حیات ؛ اتا تج کو مرنے سو ہوگا نجات
عبث عمر ناچیز کھوتا ہے تو ؛ عبث بھار دنیا کی ڈھوتا ہے تو
اے دنیا تو ناچیز ہے بے وفا ؛ اُسے پیار کرنے میں کیا ہے نفا
طلب اس کی رکھنے میں ہوتا کلاب ؛ اُسے دور کرنے میں پاتا ہے لاب
دنیا کے ہیں طالب مخنث کتے ؛ ہیں جنت کے طالب مونث کتے
جو طالب خدا کے سو وہ نر ہوے ؛ مذکر ہوے اور بہرور ہوے
اسی واسطے میں کتا ہوں تجھے ؛ ہوا دیکھ ناچار کہنا مجھے
امیں سا تجھے دیکھ مرشد ملا ؛ تو مشہود ہو تجہ کہ شاہد ملا
اتا چھوڑ دے دل سوں غفلت کے کام ؛ اتا جام سوں کام لا توں مدام
اتا چھوڑ سب تن کی مستی کو توں ؛ اتا چھوڑ دنیا کی ہستی کو توں
اتا دم کو ناچیز نا جان دے ؛ اتا نفس کو دل میں نا آن دے
امیں سا تجھے دیکھ ساقی ملا ؛ بڑے بخت مئے تج کو باقی ملا
ہمیشہ اتا مست سرشار ہو ؛ اتا یار سوں مل کے توں یار ہو
اتا یار سوں مل کے تو ایک ہو ؛ اپس سوں جدا اس کو نا لیکہ تو
عجب جام ہے ہات میں یار کے ؛ سو اس یار جو سار دل دار کے
یو جو دیکھ لے یار اس جام کو ؛ نہ کر عذر دیکھ اس کام کو
دما دم تو اس جام کو نوش کر ؛ دنیا دین کو سب فراموش کر

اسی سلسلے میں وہ کہتے ہیں کہ اے معظم میری زندگی کی شب قریب الختم ہے۔ صبح کاذب نمودار ہوگئی ہے۔ اس لیے شرابِ کہنہ کے جام جلد جلد پیتا چلا جا:

ہوا صبحِ کاذب تو کر نا شتاب ؛ پینا بیگ کہتے ہیں کہنہ شراب

اس شعر سے صاف ظاہر ہے کہ شجرۃ الاتقیا، شاہ معظم نے اپنی زندگی کے آخری

دور میں لکھی تھی۔

مثنوی کے ابیات کی تعداد (۵۰۰) بتانے کے بعد اپنے پیر کے ذکر پر مثنوی کو ختم کرتے ہیں :

یو مکتوب کیا جھاڑ ہے بار دار ٭ دیکھو سب یو وحدت سوں آیا ہے بار
اتا پانچہ سو بیت بولا ہوں میں ٭ جو بولو کہے سو چہ کھولا ہوں میں
او قادر غیور (اور) دانا کتے ٭ چھپی بات نا بھار کرنا کتے
معظم اتا ختم کر بات کو ٭ اتا رکھ قلم تو اپس ہات کو

شجرۃ الاتقیا، معظم کی سب سے طویل مثنوی ہے۔ ان کی دوسری مثنویوں کی طرح اس مثنوی کی زبان اور اس کا اسلوب بیان دونوں سبک، سلیس، رواں اور پُر زور ہیں۔ واقعات اور روایات، شاعر کے اظہار پر ایک طرح سے پابندی عاید کر دیتے ہیں اور اس کی جولانیِ طبع کا دائرہ محدود ہو جاتا ہے۔ لیکن ان تحدیدات کے باوجود معظم کے بیان کی روانی، زبان کی چُستی اور اسلوب کی شگفتگی میں کوئی فرق آتا ہے اور نہ فکر کا البیلا پن اور تخیل کی ندرت متاثر ہوتی ہے۔

معظم نے بزرگانِ سلسلہ کی مدح میں شکوہ پیدا کرنے کے لیے الفاظ کا طلسم باندھا ہے اور نہ صنائع بدائع کی مرصع کاری کا سہارا لیا ہے، بلکہ وہ ہر بزرگ کے کمالات مقامات اور صفاتِ عالیہ کی ایسی سچی اور جیتی جاگتی تصویر پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس کا حسن صداقت مشاطگی کا محتاج نہیں ہوتا اور جو اپنے اچھوتے پن کی وجہ سے خود بہ خود دل میں اتر جاتا ہے۔

معظم کے سہلِ الممتنع اسلوب کا مطالعہ کرنے والا سرسری نظر میں اُن کے سادہ و پرکار فن کی عظمت کا اندازہ کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ اس لیے کہ یہ وہ فن ہے جو بہ ظاہر بہت آسان معلوم ہوتا ہے، لیکن جس کا برتنا تمام اسالیب بیان سے زیادہ مشکل ہے۔



جب وہ اس حقیقت کو پیش نظر رکھتا ہے کہ معظم کے عہد میں زبان کس تشکیلی دور سے گزر رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی تخلیق کی دشوار گزار راہوں، ان کے پیچ و خم اور ان کے نشیب و فراز سے گزر کر شاعر کے ذہنی سفر کا اندازہ کرتا ہے تو اس پر یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ یہ فن جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ اور یہ اسلوب خونِ جگر کی ارزانی کے بغیر نصیب نہیں ہوتا۔

بزرگانِ سلسلہ کے حالات و واقعات اور روحانی کمالات تقدس اور احترام کے نورانی ہالے کے باوجود شاعری کا موضوع بنتے ہیں تو اپنی ساری آب و تاب کھو دیتے ہیں اور انتہائی خشک اور غیر دل چسپ معلوم ہونے لگتے ہیں لیکن معظم نے اس بے رس موضوع میں بھی جان ڈال دی ہے۔ اس مثنوی کی کامیابی میں جہاں معظم کے جذبات کے خلوص، اُن کے دل کے گداز، اُن کی طبیعت کی شگفتگی اور ان کی زبان کی لطافت کو دخل ہے وہیں اس کی کامیابی میں ترکیب و تنظیم اور ترتیب و تسلسل کا بھی بڑا حصہ ہے۔ معظم کی تمام مثنویوں کا یہ امتیازی وصف ہے کہ موضوع کی نوعیت جو بھی ہو وہ نظم کی ہیئت اور فن کے تمام پہلوؤں پر خصوصیت کے ساتھ توجہ دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ہر مثنوی میں آغاز، ارتقا اور اختتام کا وہ حُسن ہوتا ہے جو ہر کامیاب نظم کا فنی تقاضا ہے۔ معظم کی منظومات کا یہ وصف اس لیے بھی بہت زیادہ متاثر کرتا ہے کہ ان کے ہم عصر صوفی شعرا کا کلام اس سے عاری ہے۔

# دیوانِ معظم

شاہ معظم مثنوی نگار ہی نہیں غزل گو بھی تھے۔ انھوں نے غزلیات کا ایک دیوان یادگار چھوڑا ہے۔ اُن کے ہم عصر غزل گو شعرا میں شاہی، نصرتی، ہاشمی، شغلی اور ایاغی قابلِ ذکر ہیں، لیکن ان میں سے صرف شغلی[51] اور ہاشمی[52] کے دیوان ملتے ہیں۔

شاہ معظم کے دیوان کے تین نسخے دست یاب ہوئے ہیں، جن میں سے ایک کتب خانۂ نواب سالار جنگ میں، دوسرا کتب خانۂ انجمن ترقی اردو، ہند، دہلی، میں اور تیسرا ایک خانگی کتب خانے میں ہے۔

## ۱۔ کتب خانۂ نواب سالار جنگ، حیدر آباد

مخطوطہ نمبر (۹۱ دواوین) تعدادِ صفحات (۳۰)، تعدادِ غزلیات (۵۰) تقریباً

یہ ایک ناقص الاول، ناقص الاوسط اور ناقص الآخر نسخہ ہے۔ بہ حالتِ موجودہ جو صفحات رہ گئے ہیں، اُن میں بھی ترتیب نہیں ہے۔ غالباً جلد بندی میں اوراق آگے پیچھے

[51] دیوانِ شغلی، احمد خاں صاحب درویش کو کہیں سے دست یاب ہوا تھا، جس کو راقم الحروف نے سرسری طور پر دیکھا ہے۔

[52] ہاشمی کا دیوان ڈاکٹر حفیظ قتیل نے مرتب کر کے شائع کر دیا ہے۔



ہو گئے ہیں، تاہم رکاب سے اُن کی ترتیب کا پتا چلایا جا سکتا ہے۔

اس نسخے میں صرف ردیف ا، ب، ت، ٹ، ق، ک، گ، ل، م اور ن کی غزلیں ہیں۔ ردیف ا کی غزلوں کی تعداد زیادہ ہے۔ قصیدے، منقبت اور مدح کو بھی ردیف کے اعتبار سے شریکِ دیوان کیا گیا ہے۔

## ۲۔ کتب خانۂ انجمن ترقی اردو، ہند، دہلی

مخطوطہ نمبر (۱۷ دواوین)، تعدادِ صفحات (۱۰۰)، تعدادِ غزلیات (۲۸۶) تقریباً۔

یہ نسخہ بھی ناقص الاول و ناقص الآخر ہے۔ درمیان سے بھی کہیں کہیں صفحات غائب ہیں۔ ا سے ی تک ہر ردیف میں غزلیں ہیں۔ اس نسخے میں بھی غزلوں کے ساتھ نعت، منقبت اور مدح وغیرہ شامل ہیں۔

دیوان کے خاتمے پر کسی مثنوی کے (۳۶) صفحات ہیں، جن کا ذکر علاحدہ کیا جائے گا۔

## ۳۔ کتب خانۂ سیّد سلطان محی الدین قادری،

پہلے دو نسخوں کی طرح یہ نسخہ بھی نامکمل ہے، تاہم ا سے ی تک ہر ردیف میں غزلیں ہیں۔ اس نسخے کے خاتمے پر بعض صوفیائے بیجاپور کے سنینِ وفات اور قطعاتِ تاریخ درج ہیں۔ انھیں صفحات پر وہ قطعۂ تاریخِ وفات بھی ہے جو محمود خوش دہاں نے شاہ برہان الدین جانم کی وفات پر لکھا تھا۔ اس نسخے میں بھی نعت، منقبت اور مدح شامل ہیں۔

مشتاق، لطفی اور شہباز یا ان میں سے کسی ایک کو بھی بہمنی دور کا شاعر تسلیم کیا جائے، تو دکھنی غزل کا آغاز بہمنی دور میں ہو چکا تھا اور اگر یہ شاعر بعد کے دور سے تعلق رکھتے ہیں تو پھر غزل گوئی کے آغاز کا سہرا گول کنڈے کے سر بندھتا ہے اور ملا خیالی

محمود اور فیروز اس صنف کے ابتدائی دور کے شاعر مانے جائیں گے۔

محمود، خیالی اور فیروز کی استادی مسلم لیکن صنف غزل کا اعتبار محمد قلی قطب شاہ سے قائم ہوا، جس نے اپنی رنگینیٔ طبع، سرمستیٔ شباب اور وارفتگیٔ حسن و عشق ہی کا نہیں اپنے عہد کی تہذیبی زندگی اور اپنے دور کے مخصوص جمالیاتی ذوق کا ترجمان بناکر اُس کو نیا رنگ و آہنگ دیا، نئی وسعتوں اور رفعتوں سے آشنا کیا اور کمیت و کیفیت ہر دو اعتبار سے اُس کا پلہ گراں کر دیا۔ وہ اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر ہے اور اُس نے دیوان مرتب کر کے ایک ایسی روایت قائم کی جو غزل کی مقبولیت اور اُس کے روشن مستقبل کی ضامن بنی۔

محمد قلی قطب شاہ کی پیروی میں غزل گوئی کا رجحان عام ہوا اور دیوان مرتب ہونے لگے۔ گیارھویں صدی اس صنف کو راس آئی۔ اب اُن کی لَے دھیمی نہیں رہی تھی۔ مثنوی کی دھوم دھام کے باوجود اُس کے سُر اُونچے ہو گئے تھے اور مثنوی کے مسلم الثبوت استاد بھی، شہرت عام اور بقاے دوام کا سامان فراہم کرنے کے باوجود، عورتوں سے باتیں کرنے اور عورتوں کی زبان میں باتیں کرنے کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ اگر لطفی اور شہباز کی ریختیاں بہمنی دور سے تعلق نہیں رکھتیں تو بھی یہی ریختیاں اس صنف کے اولین نمونے مانی جائیں گی۔ فرق صرف یہ ہو گا کہ انھیں بہمنی دور کی بجائے عادل شاہی دور کی پیداوار تسلیم کیا جائے گا۔ گول کنڈے کی ریختی کے اولین نمونے محمد قلی قطب شاہ کے دیوان میں ملتے ہیں۔ اس طرح دکھن میں غزل اور ریختی کے دھارے ساتھ ساتھ

---

لہ ڈاکٹر زور نے ان کا ذکر بہمنی دور میں کیا ہے (دکھنی ادب کی تاریخ، صفحہ ۱۶، ۱۷، ۲۵) سخاوت مرزا مشتاق اور لطفی کو بہمنی دور کے شاعر مانتے ہیں (قدیم اردو کی ایک نایاب بیاض، اردو، اکتوبر ۱۹۵ ۶ء) اور نصیر الدین ہاشمی نے بھی اُن کو بہمنی دور کے شعرا میں شامل کیا ہے (دکن میں اردو، چھٹی اشاعت، صفحہ ۴۴، ۴۷)



چلتے ہیں۔

بیجاپور میں غزل کی روایت دیر میں شروع ہوئی۔ محمد قلی قطب شاہ کا ہم عصر بیجاپوری حکمران ابراہیم عادل شاہ ثانی بھی شاعر تھا، لیکن یہ دونوں تاج دار شاعر دکھنی ادب اور دکھنی تہذیب کے دو علاحدہ دبستانوں کی نمایندگی کرتے ہیں۔ دبستانوں کے اسی اختلاف نے ہند لمانیت کے علم بردار اور ہم عصر ہونے کے باوجود، ایک کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروے کار لانے کے لیے گیت کی ہیئت اور دوسرے کو غزل کی صنف اختیار کرنے پر مجبور کیا، لیکن یہ دبستان دو ایسے دھارے نہیں تھے جو متوازی چل رہے ہوں۔ وہ ایک دوسرے سے متاثر ہوتے اور ایک دوسرے کو متاثر کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ عبد اللہ قطب شاہ نے نورس کے جواب میں گیت لکھے[لہ] اور ابراہیم عادل شاہ ثانی کے دور کے بعض شاعروں: فانی، مقیمی وغیرہ نے گول کنڈے کے شاعروں کی پیروی میں غزلیں کہیں۔ بعض محققین شہباز حسینی کو بھی اسی دور کا شاعر قرار دیتے ہیں۔ محمد عادل شاہ کے عہد کے شاعروں میں ظہور، رستمی اور ملک خوشنود کی غزلیں ملتی ہیں۔ یہ بیجاپور میں غزل کا ابتدائی دور تھا۔ یہاں غزل گوئی کو فروغ در اصل علی عادل شاہ ثانی شاہی کے زمانے میں ہوا۔ نصرتی کا گل دستہ، کلیاتِ شاہی، دیوانِ ہاشمی، دیوان شغلی اور دیوانِ معظم لگ بھگ اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ شاہی کے کلیات میں صرف اُنیس[۱۹] غزلیں ملتی ہیں، نصرتی کا گل دستہ ناپید ہے، اس لیے صاحبِ دیوان شاعر معظم، ہاشمی اور شغلی قرار پاتے ہیں۔

نظام شاہی سلطنت کی تباہی کے بعد حسن شوقی بیجاپور چلا آیا تھا۔ وہ مثنوی ہی کا نہیں غزل کا بھی بڑا شاعر تھا، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی غزلوں کا دیوان مرتب

---

لہ ڈاکٹر زور، دکنی ادب کی تاریخ، صفحہ ۷۹

نہیں ہوا۔ اور اگر ہوا تو ہم تک نہیں پہنچا۔ اب تک اس کی صرف تیس[1] غزلیات دست یاب ہوئی ہیں۔

شاہ معظم صاحبِ دیوان شاعر ہیں، لیکن اُن کے ہاں غزل کی وہ روایت نہیں ملتی جو محمد قلی قطب شاہ سے ہوتی ہوئی، اُن کے معاصرین شاہی اور نصرتی تک پہنچی تھی اور جس میں حسن سے مراد جسم اور عشق سے مراد عیش کوشی تھی۔ مہکتے اور چہکتے جسموں کے اسرار اور کھل کھیلنے کے اطوار غزل کا محبوب موضوع تھے، اور ان کی تان ٹوٹتی تھی۔

ترے مرے پاواں سکی جیوں ناگ ناگن مل رہے

یہ دربار کی روایت تھی، لیکن ایک اور روایت خانقاہ میں پروان چڑھ رہی تھی جو منتاقی لطفی، اور شہباز سے ہوتی ہوئی معظم تک پہنچی اور مسایل و اصطلاحات سے گزر کر عشق کی آگ میں تپ کر کندن بننے کے لیے سراج کی منتظر تھی۔ یہ خانقاہ کی روایت کا عبوری دور تھا اور شاہ معظم اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا حسن اور عشق کا تصور علوی ہے۔ وہ کائنات کے ذرّے ذرّے میں حُسنِ ازل کو دیکھتے ہیں، عشق کو سرِّ تخلیق مانتے ہیں، عرفانِ نفس کو عرفانِ ذات کا وسیلہ جانتے ہیں، اسی دنیا میں دیدارِ حق کے قایل ہیں، وصل اُن کے نزدیک مَن و تُو کے امتیاز اور اعتبار سے گزر جانے کا نام ہے، جس کے بعد نہ عبد رہتا ہے نہ معبود، نہ عشق نہ عاشق نہ معشوق، نہ محبت نہ محب نہ محبوب:

بے مثل دو جہاں میں ہے یار کا جمال ؞ بے چوں و بے چگونہ، بے شبہ بے مثال

گاہے سلیماں ہوا ہیں، گاہے دیکھو بلقیس ہو ؞ کیا کیا مکر ظاہر کروں، مکار اور عیار کا

[1] مولوی عبدالحق نے دو (اردو بابت جولائی ۱۹۲۹ء) سخاوت مرزا نے تین (اردو بابت اپریل ۱۹۵۴ء) حسینی شاہد نے پانچ (قدیم اردو، جلد اول) بدیع حسینی نے دو (دکن میں ریختی کا ارتقا) اور جمیل جالبی نے سترہ غزلوں کا پتا چلایا ہے۔ یہ تمام غزلیں دیوانِ حسن شوقی، مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی میں شامل ہیں۔



کیا خلقت یو خالق نے مگر خود دیکھنے خاطر ؞ کیا ہے عرش اور کرسی، دھرت اور گگن پیدا

محروم ہیں ازل سوں، ان کو تو نیچ دستا ؞ ہور عاشقاں تو کہتے دستا ہے جگ اُجال

میں تو سے جا گزر تو وصلت اسے کہتے ہیں ؞ اٹھ یاد اور بسر تو، عشرت اسے کہتے ہیں

اس سر کی کر کے سیڑھی بگلی سو چڑکے جا تو ؞ عشاق سب کہتے ہیں دیدار پھانچ پانا

کدھیں نجالس ہوا میسر دام شہ کا کتا ہور، تج کو ؞ محل قرب کا عجب ہے جا کا صدر چڑے پر عبث اُترنا

معظم نے تصوف اور معرفت کے جن مسایل، موضوعات، نکات اور مقامات کی تشریح و تفہیم اپنی مختلف مثنویوں میں کی ہے، اُن کا سرمایۂ فکر و نظر اور حاصلِ عمرِ رواں ہے اور اسی کو اُنھوں نے غزل کے پیمانوں میں سمونے کی کوشش کی ہے:

ایمان سا جواہر تج پاس ہے امانت ؞ رکھا نہیں جتن کر بھی تو رکھا سو کیا

کر پیر کی پرستش دیکھا نہیں جو حق کو ؞ رویت تو کچھ کھلا نیں نعمت لیا سو کیا

جس ڈر نہیں خدا کا اور لاج نیں ہے کل کی ؞ او نفس کا ہے بندہ رو ہور رہا سو کیا

ہے علم کا نہایت ہونا خدا سوں واصل ؞ کسبی علم ہے پردا بھی تو سکیا سو کیا

ترلوک کو زیور دیا کہتے ہیں اپنے نور سوں ؞ نورِ علیؑ ہے نور او معدن کتے انوار کا

پنج وقت کا عبادت کرتے ہیں زاہداں سب ؞ صوم و صلوات اپنا دائم مدام رکھنا

تو شیخ میں نفی ہو، دیک شیخ میں نبی سوں ؞ تب پائے گا دھنی سوں درجا بلال کا

دیکھو بلال بانگی دیکھے نبی میں حق کو ؞ تب عرش پر گزر تھا حضرت بلال کا

اس چار تن سو مر باچے اگر کدھیں تو ؞ تب تج کو چٹ لگے گا مومن کے خیال کا!

یار کے دیدار کو فردوس بھی زنداں کہتے ؞ یار کی درگاہ کو کہتے ہیں سب دار السلام

سرمست لاابالی مجذوب کیوں ہوئے ہیں ؞ دیکھے ہیں کچھ کہتے ہیں اس یار کا خیال

مجہ یار بول کہنا راز و نیاز اپنا ؞ ہے قال یو اسی کا میرا ہے کیا مجال

یہ تصوف کے مضامین و مسایل ہیں، جنھیں شاہ معظم منتر کی طرح دہراتے ہیں۔ ان

مسایل کی اپنی اہمیت ہے لیکن جب تک مسایل اور مضامین احساسات اور جذبات کے سانچوں میں نہیں ڈھل جاتے، اُن میں شدت، شوریدگی اور سپردگی نہیں پیدا ہوتی، ---
--- اور وہ حسن، شعریت اور تاثیر سے محروم رہتے ہیں۔ اس لیے شاہ معظم مسایل کی کھتاونی کی بجاے واردات، کیفیات اور مکاشفات کی بازآفرینی سے کام لیتے تو زیادہ کامیاب ہوتے اور جہاں اُنھوں نے یہ رنگ اختیار کیا ہے کامیاب رہے ہیں۔

معظم ہر غزل کے مقطعے میں اپنے شیخ قادر کا ذکر التزام کے ساتھ کرتے ہیں اور بڑے پیار اور والہانہ پن کے ساتھ کرتے ہیں۔ شیخ کا نام آتے ہی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُن کی شخصیت کا ہر تار جھنجھنا اٹھتا ہے:

دل برسوں مل معظم عشرت مدام کر تو ⁂ قادر ترا سنگاتی تیرے سنگات ہے لگ
قادر سوں سیچ معظم نا ہو جدا اتا تو ⁂ دامن کو ہات سٹ کر ہونا کتے ہیں مائل
یو راز معظم بولا ہے اور موتی لاکر رولا ہے ⁂ تب کلمہ اوس کا بولا ہے جب قادر اوس ہوشیار کیا
بزرگی اسم اعظم کی کیا قرآن میں لیکن ⁂ معظم کو مدد کرنے سو قادر نام خوش لگتا
اے بادشاہ کشور تیرا ہے نام قادر ⁂ مشتاق ہے معظم دے جام اور نوالا
ہوشیار ہو معظم، قادر صبا پوچھے گا ⁂ مجہ باج بھی جہاں میں ناحق رہا سو کیا
قادر تجھے مدد ہے کیا ڈر اتا معظم ⁂ او پیشت بان کتے سو کرا ہے ہمارا
ناحق معظم ویک تو سپڑا ہے اس جنجال میں ⁂ کی نعمتاں الوان ثمر قادر سوں مل کھانا بھلا
او بادشاہ خوباں قادر ہے نام اوس کا ⁂ خلعت عطا کرے گا سن کر کلام میرا
میرا معظم ناؤں رکھ عالم پو یوں ظاہر کیا ⁂ قادر بڑا داتا ہے پھر کیا کرے گا دیکھنا
عشاق سب کتے ہیں اٹھ آج کچھ فکر کر ⁂ قادر سوں مل معظم کلمہ کلام کرنا

اگر مقطعوں کا یہ آہنگ، اُن کی غزل گوئی کا آہنگ بن جاتا تو اُن کی غزل کے تیور ہی کچھ اور ہوتے۔



معظم طبعاً صوفی صافی تھے۔ وہ عاشق ہوے بھی تو اپنے پیر کے عاشق ہوے۔ بہ ظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نہ اُنھیں حسن مجاز سے سابقہ پڑا تھا، جس کی رنگینیاں شاعر کی فکر و نظر پر چھا جاتی ہیں اور نہ وہ اس عشق مجاز کے لذت چشیدہ تھے، جس کی جنوں سامانی خیر و شر کے پیمانوں کو ٹھکرا کر آگے بڑھ جاتی ہے اور گرمیِ گفتار بخشتی ہے، لیکن اُن کے ہاں مجازی حسن و عشق کے مضامین غمازی کرتے ہیں کہ وہ اس کوچے سے ناآشنا نہ تھے، البتہ وضع احتیاط کے تقاضوں نے مجاز کے واردات و تجربات کے اظہار پر پہرے بٹھا دیے تھے:

ترے یو نین جادوگر کیے ہیں مجہ کو پڑ مردہ ⁂ بچن منتر سوں جیتا ہوں، نہیں مجہ کام مرہم کا
دستا الف احد جیوں قامت ہمارے یار کا ⁂ شیریں سخن اعجاز جیوں عیسیٰ نمن دل دار کا
دیکھو یک نام سوں جس کے موے سو پھر کے جیتے ہیں ⁂ سو جیوں اعجاز عیسیٰ تھا میٹھا گفتار یوں اچھنا
ہوا روشن یو عالم سب کتے ہیں جس کے پرتو سوں ⁂ منور جیوں چندر اس کے کتے رخسار یوں اچھنا
دہن تنگ اور کمر نازک بدن نرل عجب خوش تر ⁂ پریشاں زلف پر فتنہ کتے عیار یوں اچھنا
نقاب زلف مشکیں تو کرے جب دور مکھ پر سوں ⁂ او جالا پل میں ہوتا ہے مجھے فرصت ہے اسی دم کا
کاکل کے بیچ اس کے کیا کم ہیں او بلا سوں ⁂ بیٹھے بچن بلا اور اس کا ادھر بلا
یو دل مرا بھنور ہو لبدا ہے یار اوپر ⁂ اے یار تجہ گلے میں پھولوں کی دیکھ مالا
مکھ پر سوں کاڑ تیرے زلف نقاب مشکیں ⁂ پڑتا ہے دیکھ شبنم تو پھل رہا ہے لالا
گلزار تجہ بدن کا سایہ ہے مے پینے کو ⁂ شمشاد سو کہاں کم قامت ترا ہے بالا

اس رنگ کی ایک غزل میں بڑی دل چسپ تشبیہ استعمال کی ہے:

دل بر کے مکھ اوپر کا کالا یو خال مج کو ⁂ مجلس میں جیوں نبی کے حبشی بلال دستا

لیکن حیرت ہوتی ہے کہ وہ شاہد مجاز کے خد و خال، ناز و ادا، جور و جفا کا ذکر کرتے کرتے یک لخت اپنے شیخ، یا کسی بزرگ سلسلہ یا خدا اور رسول کی طرف آ جاتے

ہیں اور شاہدِ مجاز سے متعلق پچھلے اشعار میں وہ جو کچھ کہہ آئے ہیں، اُس کو اپنے شیخ، بزرگِ سلسلہ یا شاہدِ حقیقی سے منسوب کر دیتے ہیں اور پڑھنے والے کی عقل اس تضاد و اتحاد کی بوالعجبی پر انگشت بہ دنداں رہ جاتی ہے۔ مثلاً ذیل کے اشعار میں حضرت غوث الاعظم کی مدح کے سلسلے میں حسنِ مجاز کے جن اوصاف سے اُن کو متصف کیا ہے، وہ محلِ نظر بھی ہے اور موجبِ حیرانی بھی:

تیرا قدم کھاندے اوپر سارے ولی کرتے قبول
روشن منور نامور تو غوثِ صمدانی ہوا
تجہ حسن کا کر لے بیاں قدرت ہے کس انسان کو
تجہ لعلِ لب کے فیض سوں، لعل بدخشانی ہوا
تجہ نین سوں نرگس ہوا اور زلف سو سنبل کتے
تیرے دسن کی جوت سوں یاقوت مرجانی ہوا
معشوق سچہ حق کا کتے قادر محی الدین ہے
والی معظم کا دیکھو او شاہِ جیلانی ہوا

اسی طرح ایک غزل میں یارِ گل بدن، بادشاہِ خوباں اور جرعۂ لب کے ذکر کو اپنے شیخ قادر سے وابستہ کر دیا ہے:

اِس یارِ گل بدن کو بولو سلام میرا ؛ بعد از کہو حقیقت سارا تمام میرا
اول اوسے سرا کر بولو یو سب حقیقت ؛ او داد گر ہے داور دے گا انعام میرا
امید دو جہاں کا رکھتا ہوں میں اوسی سوں ؛ اوس نام کا وظیفہ ہے صبح و شام میرا
ایمان سا جواہر صدقہ کیا ہوں اوس پر ؛ ہور جاں نثار کرنا اکثر ہے کام میرا
یک جرعہ اپنے لب کا نا بھیجتا سبب کیا ؛ میں عقل سوں پچھانا ہے عشق خام میرا
او بادشاہِ خوباں قادر ہے نام اوس کا ؛ خلعت عطا کرے گا سن کر کلام میرا



اس سے زیادہ دلچسپ مقام وہ ہے، جہاں وہ اللہ تعالیٰ کے لیے گل بدن کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں:

اُس یارِ گل بدن کو بے چوں کتے سبب کیا ؛ دستا چہ نیں تمثّل اُس کے مثال کا
با چوں ہے روپ اُس کا بے چوں کتے سبب کیا ؛ خورشید سوں منوّر اس کا مثال دستا
اُس گل بدن سوں ملنے پیدا کرے وسیلہ ؛ نیں تو کتے ہیں ملنا اکثر محال دستا

اسی طرح مکار، عیار، پرفن، پر بلا وغیرہ جیسے الفاظ، جو اردو غزل میں محبوب کے لیے استعمال ہوتے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ اور اپنے شیخ کے لیے بے تکلف استعمال کرتے ہیں:

گا ہے سلیماں ہوا ہیں، گا ہے دیکھو بلقیس ہو ؛ کیا کیا مکر ظاہر کروں، مکار اور عیار کا
قادر ہے نام جس کا پرفن ہے پر بلا ہے ؛ قامت علم قیامت بلا سوں بتر بلا را
عارف کتے معظم کیوں کر پڑا بلا میں ؛ مشہور ہے جہاں پر اُس کا مکر بلا
ہوا ہوں یار میں اُس سوں و لیکن ہیچ ڈرتا ہوں
سنیا ہوں واصلاں سوں میں کتے اغیار قادر ہے

حقیقت اور مجاز کی یہ آنکھ مچولی اور لفظی و معنوی یہ دو رنگی اُن کی اکثر غزلوں میں ملتی ہے اور اس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ غزل کا سرمایہ لفظی و معنوی جو مجاز کے رنگ میں رنگا ہوا ہے غزل گو معظم کا دامن تھام لیتا ہے، لیکن شاہ معظم کا دل اپنے پیر کے ذکر اور حقیقت کے بیان سے منہ موڑنا نہیں چاہتا، جس کی وجہ سے اُن کی اکثر غزلیں شتر گربگی کا شکار ہو کر رہ گئی ہیں۔ تاہم اُن کے ہاں ایسی غزلیں بھی مل جاتی ہیں، جن میں اُن کی فکر کا محور نہیں بدلتا اور حقیقت و مجاز دست و گریباں نظر نہیں آتے۔ ان غزلوں کا اپنا آہنگ ہے، جن میں داخلیت کی دھیمی دھیمی آنچ اور لب و لہجے کے گداز نے تیکھا پن پیدا کر دیا ہے، لیکن یہ خصوصیات انھیں غزلوں میں پیدا ہو سکی ہیں، جن میں مسائل براہِ راست

نہیں آئے ہیں بلکہ تجربے اور احساس کے سانچوں میں ڈھل گئے ہیں۔ ان غزلوں کی زبان بھی سادہ و پرکار ہے:

اے دل تو اس دنیا میں آکر کیا سو کیا ؛ کرنا سو توں کیا نیں لئی دن جیا سو کیا
آبِ حیات کہتے، دل بر کے ہے ادھر میں ؛ او جام تجہ ملا نیں بھی تو پیا سو کیا
جس پر لئی محبت او چیز حق منگا ہے ؛ پیارا تو جی ہے تن میں، بھی تو ل دیا سو کیا
دل پھاٹ پھوٹ تیرا کئی لخت ہو رہا ہے ؛ سب تن جھجر ہوا ہے بھی تو سیا سو کیا

---

مقبول دو جہاں میں یک یار ہے ہمارا ؛ معشوق ہوئے مہرباں دل دار ہے ہمارا
آثار مجہ گلے میں رکھتا ہوں عاشقوں کا ؛ ہر تار اوس زلف کا زنار ہے ہمارا

---

میرا تو دل برجان ہے پھر کیا کرے گا دیکھنا ؛ اکثر مرا غم خوار ہے پھر کیا کرے گا دیکھنا
اس مکر کے سِکنے بدل پھرتا ہے گردشِ رات دن ؛ ایسا او خود مکار ہے پھر کیا کرے گا دیکھنا

---

مجہ دل میں یو ہوس ہے دل بر کو پیار کرنا ؛ ہور مکھ اوپر سوں اوس کے یہ جیو نثار کرنا
یو عشق ناگ جس کو کاٹے اچھے کہے تو ؛ کوی گاڑٹی ملے تو بِس کا اتار کرنا

---

ہے عشق آگ کہتے کاں لگ چھپا رکھے گا ؛ بہتر ہے راز اپنا سب خاص و عام کرنا

مج کو تو اس دنیا منیں کیا خوب میخانہ دسیا
روشن، منور، بے بدل، نادر یو خم خانہ دسیا
عشاق تو ماتے رہتے دل دار کے دیدار میں
عارف ادسی کو جاننا جس ہات پیمانہ دسیا



دو نو جہاں سو رخ پھرا دل بر سوں دل باندھا ہوں میں
تب عاشقاں کہتے مجھے تو ایک افسانہ دسیا
دل دار کے اس شہر کو جس دن مرا جانا ہوا
ترتیب الٹھا دیک کر بے ہوش دیوانا دسیا

---

اول سوں میں عاشق انتھا دل دار کے دیدار کا
پھر دیکھتے مجنوں کو جیوں لیلا چہ کا بھانا ہوا
جب سوں مجالس یار کا بھر کر نظر دیکھا ہوں میں
تب سوں دیکھو سب عیش یو مج کوں تو افسانا ہوا

---

اظہار کیوں کروں میں یو راز دل ربا کا
مجہ پر ہے شرم غالب آتا ہے مج کو غیرت

---

یو عارفاں سمجھتے عاشق یو کیں ہوا ہے
دستا ہے مجہ اوپر سب یو عشق کا علامت

---

معشوق سوں ملے لگ عاشق کوں کاں صبر ہے
جو کوئی ہیں لا اوبالی کر تیج نیں د رنگ

---

شاہ معظم خرباتی شاعری کے بڑے دل دادہ ہیں۔ اردو کا پہلا ساقی نامہ انھیں کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے، جس پر پچھلے صفحات میں تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ اُن کی اکثر غزلوں میں مئے و

مستی کے مضامین ملتے ہیں۔ بعض غزلیں تو پوری کی پوری خمریات سے تعلق رکھتی ہیں۔ جذبات کی لہک، اور لب و لہجے کی کھنک جس سے غزل میں لوچ، گھلاوٹ اور نکھار پیدا ہوتا ہے، شاہ معظم کے مسائل و معارف میں ملتی ہے اور نہ شاہدِ مجاز کے ذکر میں، لیکن جہاں کہیں وہ اپنے شیخ یا شراب کا ذکر چھیڑ دیتے ہیں تو ان کے اشعار میں غزل کا تب و تاب پیدا ہو جاتا ہے:

مشرق طرف صبح کا دستا ہے دیک اجالا ؛ ساقی منگا تو بیگی وہ نقل اور پیالا
مشہور ہے روایت کہتے ہیں سب کلالاں ؛ ٹک بیگ اس پلانا جو کوئی نئی آتا لا
آثار دیک سحر کا ہوشیار سب ہوئے ہیں ؛ مرغاں چمن کے سارے، کرتے ہیں شور نالا
اٹھ بیگ مے پلا کر سب دور کر خماری ؛ اکثر شراب کہنہ دارو ہے بے مثالا
مکھ پر سوں کاڑ تیرے زلفِ نقاب مشکیں ؛ پڑتا ہے دیکھ شبنم تو پھل رہا ہے لالا
گل زار تجہ بدن کا سایہ ہے مے پینے کو ؛ شمشاد سو کہاں کم قامت ترا ہے بالا

---

ایمان دے کتے ہیں کہنہ شراب پینا ؛ دو چار جام پی کر دارو خمار کرنا
آیا ہے پھر زمستاں مل یار سوں پینا مے ؛ اور دل کو اس چمن کے تازہ بہار کرنا

---

ہوا ہے صبح کاذب یو پلا مجہ جام او جم کا ؛ خماری دور کرتا ہور مداوا ہے کتے غم کا
نہ کر کچہ عذر اے دل بڑ نپٹ عاجز ہوا ہوں میں ؛ پلا مجہ ہات سوں اپنے قدح بھر آب زم زم کا
عجایب وقت ہے ساقی نہ ہو تو نیند کے در پے ؛ دیکھو لالے کے پھولوں پر رہا ہے بوند شبنم کا
سچیں خمار دنیا کا کیا ہے مجہ کو سرگرداں ؛ دمادم جام دے کر مجہ اٹھا دے نقش ماتم کا

ان اشعار میں شاہ معظم نے جس شراب کا ذکر کیا ہے، وہ شرابِ معرفت نہیں بلکہ خالص افشردۂ انگور ہے:



جنت میئے کہاں ہے یو جامِ ارغوانی ؛ خالص شراب لا کر تج ہات سوں پلانا

اُنھوں نے ساقی نامے میں بھی اسی مئے مجاز کی آرزو کی ہے اور وہ اس کی مستی کو بے خودی خود فراموشی اور خدایابی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ شرعی نقطۂ نظر سے قطع نظر کرتے ہوئے بھی مئے مجاز کی یہ افادیت شبہ سے خالی نہیں ہے، لیکن جو شاعر شیخ کو مکار، عیار، فتنہ اور بلا کہہ سکتا ہے اگر وہ شرابِ حقیقی کو افشردۂ انگور پر محمول کرتا ہے تو تعجب نہیں کرنا چاہیے۔ بہ ہر صورت یہ اشعار خمریات، مستی، اور ذوقِ مستی کی کامیاب ترجمانی کرتے ہیں۔

شاہ معظم کے دیوان میں قابلِ لحاظ تعداد میں ریختیاں بھی شامل ہیں۔ یہی ریختیاں اُن کے دیوان کی جان ہیں۔ شاہ معظم صاحبِ دیوان شاعر ہیں، لیکن اُن کی غزل، بحیثیت مجموعی، تغزل اور اس کے رچاؤ سے عاری ہوتی ہے اور کہیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ صنفِ نازک کے عطائے شعلہ و شرر کا تجربہ رکھتے تھے۔ ان کے ہاں وہ کرب و اضطراب بھی نہیں ملتا جس کے بغیر نہ عشقِ مجاز کامیاب ہوتا ہے اور نہ عشقِ حقیقی، لیکن ان کی ریختیوں کا مطالعہ کیجیے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کی شخصیت ہی بدل گئی ہے۔ اُن کی ریختیوں کا اپنا ایک رنگ اور آہنگ ہے، جو اُن کے پیش رؤوں اور معاصرین دونوں سے مختلف ہے۔ اُن کا تانا بانا حقیقت اور مجاز کے تار حریر دو رنگ سے تیار کیا گیا ہے اور ارضیت اور علویت کی دھوپ چھاؤں نے اُن میں نرمی اور گرمی، رنگ اور رس نور اور سرور، کیف و مستی، سپردگی اور گداختگی کی وہ کیفیات پیدا کر دی ہیں، جو ہندی کے کرشن بھگت، شاعروں کے مادھریا بھاؤ اور داپستیہ بھگتی کے لیے مخصوص سمجھی جاتی ہیں، اور جو بھوگی اور جوگی دونوں کی ذہنی، جذباتی اور روحانی آسودگی کا سامان فراہم کرتی ہیں۔

دکھن میں غزل اور ریختی کا آغاز ساتھ ساتھ ہوا۔ عورت کی طرف سے یا عورت کی

زبان میں اظہارِ محبت کی روایت غزل اور ریختی دونوں سے پرانی ہے۔ اس روایت کے فروغ کے دو اسباب ہیں۔ ایک سبب تو ہندی فلسفہ اور بھکتی شاعری کا اثر ہے۔ سانکیہ درشن میں پرشس اور پرکرتی کا یہ نظریہ پیش کیا گیا ہے کہ پرشس (وجودِ حقیقی) ساری کائنات کی اصل ہے، جس نے اپنے آپ کو روح اور مادے میں تقسیم کر دیا۔ روح کا کام مادے کی تسخیر ہے، جس سے زندگی کا اظہار ہوتا ہے۔ روح کی صفت فعالیت ہے اور مادے کی انفعالیت۔ اس لیے روح کو پرشس (مرد) کے روپ میں اور مادے (کائنات، جس میں تمام انسان بھی شامل ہیں) کو عورت کے روپ میں سمجھایا گیا ہے۔ بھاگوت میں اس نقطۂ نظر کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔[1] اس میں کرشن کے روپ میں پرماتما کی اور گوپیوں کے روپ میں تمام انسانی روحوں کی تمثیل پیش کی گئی ہے۔" یہی وجہ ہے کہ بھکت، بھگوان کو پرشس (مرد) مان کر خود استری (عورت) کے روپ میں بھکتی کرتے ہیں۔[2] کرشن بھکت شاعروں نے اس روایت کو بڑا فروغ دیا۔ انھیں کے توسط سے یہ روایت دکھنی میں پہنچی۔

دوسرے یہ کہ خود صوفیہ بندے کی انفعالیت اور شاہدِ حقیقی کی فاعلیت کو تسلیم کرتے تھے اور انھیں جہتوں کو نمایاں کرنے کے لیے، اپنے لیے تانیث اور محبوبِ حقیقی کے لیے تذکیر کے صیغے لاتے تھے۔ چناں چہ ڈاکٹر حفیظ قتیل کہتے ہیں:

> زندگی میں غالب اور مغلوب، محتاج اور محتاج الیہ، عامل اور معمول، صانع اور مصنوع اور مرد اور عورت میں جو فاعل اور منفعل کی نسبت ہے، کچھ ایسی ہی نسبت مرید کو شیخ کے ساتھ، بندے کو اللہ کے ساتھ ہوتی ہے، ہندی فلسفے میں اسی نسبت کو منش اور پرکرتی کی نسبت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسی لیے میرا بائی نے بنارس کے برہمنوں سے کہا تھا کہ مرد تو صرف ایک

[1] راجیشور پرشاد چترویدی، ریتی کالین کوتا، صفحہ ۱۱۵، بحوالہ بدیع حسینی، دکنی ریختی کا ارتقا، صفحہ ۸۰

[2] رام رتن بھٹناگر، ہندی کا بھکتی کاویہ، صفحہ ۲۰۵، بحوالہ بدیع حسینی، دکنی ریختی کا ارتقا، صفحہ ۸۱



> کرشن ہے اور باقی سب عورتیں ہیں، یعنی دینے والا صرف کرشن ہے، جن میں فاعلیت ہے اور لینے والا مرد ہو یا عورت اس میں انفعال ہے، اس لیے وہ عورت ہے۔ مرید کی شیخ کے ساتھ اور بندے کی اللہ کے ساتھ اس نسبت کے پیش نظر صوفی شعرا نے عورت کی زبان اختیار کی۔[1]

اس طرح عورتوں کی زبان میں نظموں اور گیتوں کے لکھنے کی روایت شروع ہوئی، پھر ریختیاں کہی جانے لگیں۔ دکھنی میں یہ روایت چار مرحلوں یا دوروں سے گزری ہے۔ پہلا دور وہ ہے جب کہ افعال، اسما اور صفات کی تانیث کے علاوہ عورتوں کی زبان کی کوئی خصوصیت نہیں ملتی۔ دوسرے دور میں عورتوں کے محاورے کے علاوہ اُن کی زبان کی بعض اور خصوصیات بھی پائی جاتی ہیں۔ لطفی اور شہباز اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں، تیسرے دور میں عورتوں کی زبان، لب و لہجے اور محاورے کا دائرہ زیادہ وسیع ہو جاتا ہے۔ موضوعات عام غزل ہی کے ہیں لیکن جنسی رویے، معاملاتِ عشق اور زیب و زینت کی اشیا وغیرہ کے ذکر سے ریختی کی ایک مخصوص فضا پیدا ہو گئی ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کے ہاں یہ رنگ بہت گہرا ہے۔ وہ غزل میں کھل کھیلتا ہے، معاملات کا اظہار برملا کرتا ہے، وصل کے ہر لمحے کے مرقعے بڑے شوخ رنگوں میں کھینچتا ہے، لیکن ریختی میں وضع احتیاط کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ اس کی وجہ بہ ظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ اپنی پیاریوں کے جذبات کا احترام کرتا ہے، اور جانتا ہے کہ جو کچھ وہ خود غزل میں کہتا رہا ہے اگر ریختی میں اپنی پیاریوں کی زبان سے کہلائے گا تو پیاری اور بیسوا میں کوئی فرق نہیں رہ جائے گا۔ یہی رنگ بہ حیثیت مجموعی شاہی تک گولکنڈہ اور بیجاپور میں رائج رہا۔ چوتھا دور ہاشمی بیجاپوری کا ہے، جس نے ریختی کو ایک مستقل اور منفرد صنفِ سخن کی حیثیت سے برتا اور اس کو معراجِ کمال پر پہنچایا۔ اس کے ہاں عورتوں کی زبان کا ہر روپ، اُن کا لب و لہجہ، اُن کے روز مرے،

[1] ڈاکٹر حفیظ قتیل، دکن میں ریختی کا ارتقا مشمولہ مجلہ عثمانیہ، دکنی ادب نمبر، صفحہ ۱۴۴

محاورے، کہاوتیں، ضرب الامثال، کوسنے، دعائیں، بد دعائیں، عقاید، توہمات، ٹوٹکے، رسومات، اُن کا طرزِ اظہار، طرزِ فکر اور طرزِ زندگی، اُن کے لباس، زیور، آرائش و زیبائش کے سازوسامان کی جو تفصیل ملتی ہے وہ اس سے پہلے کہیں نظر نہیں آتی۔ وہ خانقہی یا محلاتی ریختی کا شاعر نہیں ہے۔ عوامی ریختی کا شاعر ہے۔ اس لیے اُس کا ذخیرۂ الفاظ بھی وسیع ہے اور موضوعات اور مسایل میں رنگا رنگی، تنوع اور وسعت ملتی ہے۔ اس کے ہاں ہر مزاج، ہر عمر اور ہر طبقے کی عورت کی ازدواجی اور جنسی زندگی کے نشیب و فراز ہی نہیں ہیں، بلکہ سماجی زندگی کے وہ محرکات بھی ہیں جو ازدواجی اور جنسی زندگی کو متاثر کرتے ہیں۔ اس کے ہاں عاشقانہ، فاسقانہ اور فاحشانہ تینوں رنگ ملتے ہیں۔ آخری رنگ وہی ہے جو بعد میں ریختی کی اختصاصی خصوصیت سمجھا جانے لگا۔ مختصراً، بقول ڈاکٹر حفیظ قتیل، "جو شاعری بعد کو ریختی کے نام سے موسوم ہوئی اُس کے تمام خطوط ہاشمی کے زمانے میں متعین ہو چکے تھے اور خود ہاشمی نے اس شاعری کی نوک پلک کو اس قدر درست کیا تھا کہ رنگین اور جان صاحب لکھنؤ کے نئے ماحول اور نئی شعری روایات کے ساتھ بھی اس میں مشکل ہی سے کوئی نیا پہلو نکال سکے اور جو نئے پہلو اُنھوں نے نکالے اُن میں ہم صنفی کی لعنت قابلِ ذکر ہے، جس سے ہاشمی کا دامن پاک ہے۔"[1]

شاہ معظم، ہاشمی کے ہم عصر تھے، لیکن ان کو خانقاہ کی روایت ورثے میں ملی تھی، اس لیے فاسقانہ اور فاحشانہ مضامین کی اُن کی ریختی میں کوئی گنجایش نہیں ہے۔ وہ اپنے پیر کے عاشق تھے اور اُنھوں نے اپنی جہت انفعالیت اور پیر کی جہت فاعلیت کے اظہار کے لیے عورت کی زبان اختیار کی تھی۔ کرشن بھگتی کی شاعری اُن کے سامنے تھی جس کا مادھریا بھاؤ اور داپستیہ بھگتی ان کے مزاج اور مسلک کے عین مطابق تھے۔ اُن کے بزرگ سلسلہ شاہ برہان الدین جانم نے یہ کہہ کر اُن کے لیے راہیں ہموار کر دی تھیں۔

[1] ڈاکٹر حفیظ قتیل، دکن میں ریختی کا ارتقا مشمولہ مجلہ عثمانیہ، دکنی ادب نمبر، صفحہ ۱۴۱



یو شام سلونا توں میرا رے
نہ چلے تجھ پر منتر ٹونا رے
جو کہے چاہے سو فانی ہونا رے[1]

فنافی الشیخ کے لیے اور کیا چاہیے تھا، اس نے اپنے عشق اور واردات اور کیفیات کے اظہار کے لیے ریختی کی صنف کا انتخاب کیا اور صوفیائے متقدمین کی طرح صرف اسما، افعال اور صفات کی تانیث پر اکتفا نہیں کیا بلکہ عورتوں کی زبان، روزمرے اور محاورے، اُن کی مخصوص لفظیات: سہاگن، کالی پوت، ابرن، پان، بیڑے، مالا، پھولوں کے ہار، مسی، سہیلے، بدائی، سکھی بھی استعمال کیں، جس کی وجہ سے اس کی ریختی زبان، اظہار اور اسلوب کے اعتبار سے ہاشمی کی ریختی سے ٹکر لیتی ہے۔ ہاشمی کو اپنی سلاست پر بڑا ناز تھا لیکن معظم کی زبان سلاست، روانی، شایستگی اور وقار میں ہاشمی سے بڑھی ہوئی ہے۔

معظم کی ریختی ان کے پیر کے گرد گھومتی ہے، وہی اُن کے موہن، لال، پیو، پیا، پیارے، دولہا، سرِیجن اور سیج کے سنگاتی ہیں اور وہی اُن کے شہ اور شہنشاہ۔ اُنھیں کو معظم رجھاتے، مناتے، الکساتے ہیں، اُنھیں سے شکوہ و شکایت کرتے ہیں، اُنھیں کو ہرجائی کا طعنہ دیتے ہیں، اُنھیں کے لیے پان کے بیڑوں، پھولوں کے ہاروں، باغ کے میووں کا اہتمام کرتے ہیں، اُنھیں کے لیے سہیلے گاتے ہیں اور سیج سنوارتے ہیں اور اُنھیں پر اپنی جوانی اور دین و ایمان نچھاور کرتے ہیں۔

اُن کی ریختی کی عورت پرکیا (ایسی عورت جو پرائے مرد سے پوشیدہ طور پر محبت کرتی ہے) نہیں سوکیا (پتی ورتا) ہے۔ یہی مرید صادق اور فنافی الشیخ کی خصوصیت ہے ـــ اس لیے وہ ہاشمی کی عورت سے مختلف ہے۔ یہاں تانک جھانک ہے نہ چوما چاٹی، نہ جوبن پہ ہات' ہے اور نہ مقصود کو انپڑنے کے لیے بے دھڑک ہونے

[1] دکن میں اردو، صفحہ ۱۸۷، بحوالہ بدیع حسینی، دکنی ریختی کا ارتقا، صفحہ ۱۱۵

کا جذبہ، نہ دائی کا کھٹکا ہے نہ ساس نندوں کا خوف، نہ فحاشی ہے اور نہ عریانی، نہ جنسی تلذذ ہے نہ کھل کھیلنے کے ارمان، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ "ایک سہاگن کے مختلف جذبات ... اور ایک نیک شعار عورت کے نسوانی جذبات کی ترجمانی کی ہے۔[1]" اور یہ بھی اس لیے کہ : بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر۔

پیارے کیوں کرم کر کرا تا مجہ گھر میں آتے نیں
وگرنیں تو اپس مندھر کدھیں مجہ کوں بلاتے نیں

دریغا مجہ کوں آتا ہے شرط کر قول کیوں بسرے
اتا تو خواب میں ہرگز سپنے سوں مجہ کو لاتے نیں

اول کیوں چاو سوں مجہ کوں اپلے ابرن پناتے تھے
اتا کیوں ہار پھولوں کے گلے میں لیا کو بھاتے نیں

تمیں ساقی مجالس میں سدا خوباں کے ہوتے ہیں
وصل کا جام کوئی بھر کر مبارک لا پلاتے نیں

اس حسرت سوں رو رو کر سینا پھوٹا ہے سب میرا
اپس دل راز کیاں باتاں اپنا آکر سناتے نیں

تمیں ہیں صاحبِ عالم تمارا ناوں قادر شہ
مرے سر پر قدم رکھ کر ضیافت کھا کے جاتے نیں

---

اتھی ناداں تب لگ میں پیا تمنا نہ جانی میں
اتا چھند بند یو سارے تمارے سب پچھانی میں

[1] بدیع حسینی، دکنی ریختی کا ارتقا، صفحہ ۲۳۹



تمیں یو بار ہا کہتے جو کچھ چہتا سو کرتا ہوں
سنی میں کان سوں اپنے ہوی تب سوں سیانی میں

تمارے نین جادوگر کیے کچھ سحر میرے پر
مٹھیاں باتاں تمارے سے ہوی ہوں اب دیوانی میں

اول کیوں راز سب ذاتی سو ریجن مجہ سوں کہتے تھے
ملیاں ہیں نئی سکیاں تمنا اتا ہوی ہوں بیگانی میں
(بنگالی)

تمیں ہیں حسن کے عاشق اتا میں خوب سمجھی ہوں
جلگ کچھ حسن تھا مجہ پر اتھی تب لگ یگانی میں

تمن سیں عشق لانے سوں ہوئی رسوا دو عالم میں
تصدق سب تمارے پر کیتی ساری جوانی میں

تمیں عارف قدر داں ہیں کتے تمنا کوں قادر شاہ
کتی ہوں یو تمارے سوں سنو جی کی کہانی میں

---

پیارے کی جدائی سوں مجھے گھر وار نیں بھاتا
نہ مجہ کو کام خوش لگتا سگل سنسار نیں بھاتا

مجھے ابرن پہننے سوں سینے میں آگ لگتی ہے
لگانا تن کو خوش بو اور پھولوں کا ہار نیں بھاتا

رکھی ہوں پوت کالی میں نشانی ہے سہاگن کی
مسی داتوں کو لانا اور یو کچھ سنگار نیں بھاتا

نویلا لال قادر شاہ سنگاتی سیج کا میری
کیا ہے مجہ سوں اغیاری کسی کا پیار نیں بھاتا

صبا زینے کوں تیرے پر سہیلیاں، یوں کھڑیاں رہنگیاں
نپٹ توں لاج چھوڑی ہے بجر کی ہے تری چھاتی

سکیاں سب سات کیاں تیرے ہیں گھر کھیلتے اگر
ابھاگی کون ہے ایسی تجے بد چال سکلاتی

یو بجلیاں کا چمکنا ہوا برسنا تس پہ ساون کا
اندھارے گھر منے تجہ کوں اکیلے نیند کیوں آتی

اتا اٹھ سات چل میرے مبادا دیس نکلے گا
اجالا پل میں ہوتا ہے عبث یوں بار کیوں لاتی

کتی ہوں بات ہٹ کی ہیں یو دل کے کان سوں سن لے
نہ کر کچھ مان ایسے سوں او تیرے سیج کا ساتی

کدھیں او سیج میں اپنے بلاوے تج کوں قادر شاہ
تو اٹھ کر جواب دے بیگی نہ ہو تو نیند کی ماتی

---

اے دھن سلکھن چھوڑ ہٹ، آیا برش کالا کتے
دستا ہے سب دو ناچہ ہو، بھر کر ندی نالا کتے

بجلیاں چمکتیاں دیکھ کر رستی ہے کیوں ناداں توں
دھاراں ہوتا راں کے نمن جگ بھر پڑیا جالا کتے

بھجتی عبث ہے ہٹ بھری سایہ سیتے دل دار کے
شمشاد سوں کچھ کم نہیں او سروِ قد بالا کتے

پڑتے ہیں بوند شبنم نمن چندر ہے بھج کے اے سکی!
منے پی کے ہونا سرخرو ہور باندنا والا کتے

---



مجھے بھیجا ہے موہن نے پیاری تجہ بلانے کوں
شہنشاہ آج چہتا ہے ادھر امرت پلانے کوں

مبارک دیس آیا ہے، عبث توں آج رُستی ہے
سکیاں مشتاق ہیں ساریاں تجے شہ سوں ملانے کوں

اکیلی تجہ کوں دیکھے سو کیا ہے غم نے پژمردہ
مسیحا ہو کے آیا ہے پیارا تجہ جِلانے کوں

ہوا ہے مشورت سارا ترے مہر راج دینا کر
لیجا کر چاد سوں سب مل تجے خلعت دلانے کوں

سحر اور مکر جادو کر کیے ہیں مجہ کو دیوانی
شکایت جس کی کرتی ہوں وہی عیار یاد آیا

پھڑکتیاں ہیں انکھیاں میری سگن ہوتی ہے ملنے کی
سریجن آج فجر سوں مجھے کئی بار یاد آیا

معظم غزلوں کے ہر مقطعے میں اپنا تخلص اور اپنے پیر کا نام التزام کے ساتھ لاتے ہیں، لیکن ریختیوں کے مقطعوں میں اپنا تخلص نہیں لاتے بلکہ صرف پیر کا نام لاتے ہیں اور ان کا ذکر اس انداز سے کرتے ہیں کہ ریختی میں عورت کی طرف سے بیان کیے گیے تمام جزئیات و معاملات قادر ہی سے متعلق ہیں:

تمیں عارف قدرداں ہیں کتے تمنا کوں قادر شاہ
کتی ہوں یو تمارے سوں سنوجی کی کہانی میں

نویلا لال قادرشاہ سنگاتی سیج کا میرے
کیا ہے مجہ سو اغیاری کسی کا پیار نیں بھاتا

نویلا لال قادرشاہ مرے گھر آپ آیا کر
اتا زہرہ سوں ہل مل کر منگل شہ پر پلاتی ہوں

تمیں ہیں صاحبِ عالم، تمارا ناؤں قادرشہ
مرے سر پر قدم رکھ کر ضیافت کھا کے جاتے نیں

کدھیں او سیج میں اپنے بلاوے تج کوں قادرشاہ
تو اُٹھ کر جواب دے بیگی نہ ہو تو نیند کی ماتی

ہوا ہے غم تو سرکش لئی مرا حامی ہے قادرشاہ
مدد آکر . . . . . . . . غم خوار یاد آیا

بعض ریختیوں میں وہ پہلے شعر ہی سے اپنے شیخ کو مخاطب کرتے ہیں:

میں اپنے گھر شہنشہ کوں اتا انس دن بلاتی ہوں
بلاکر چاؤ سوں شہ کوں ادھر امرت پلاتی ہوں

اتا دل کے صدر پر میں لیجا کر بیٹھلا شہ کوں
کتک الوان نعمت لیا پیارے کوں کھلاتی ہوں

کدھیں شہ شوق کرتا یو چمن میں سیر کرنے کوں
میں اپنے تن کے جھولے میں سریجن کو سلاتی ہوں

قدم مجہ سر اُپر رکھ کر امیں شہ چل کے آیا ہے
گرد میں پاؤں کے شہ کی اپس ہاتھوں دھلاتی ہوں

ضیافت شہ کی کرتی ہوں مرا میں جان صدقہ کر
مرے کچھ باغ کا میوہ قدرداں کوں کھلاتی ہوں



نویلا لال قادرشہ مرے گھر آپ آیا کر
اتا زہرہ سوں ہل مل منگل شہ پر پلاتی ہوں

بلانے اس شہنشہ کوں اتا مہمان منگتی ہوں
تصدق اس اُپر کرنے مرا میں جان منگتی ہوں

مری ہے آرزو دل میں ضیافت یو چہ کرتی ہوں
برابر شہ سوں ہل مل کر دکھانے پان منگتی ہوں

بجز دیدار کیا کرنا مجھے فردوس ہور گلشن
سہیلے شہ پہ گا گا کر درس کا دان منگتی ہوں

مبارک دیس آیا ہے جہاں میں عید نوروزی
مرا انعام ہور خلعت کتک عنوان منگتی ہوں

مرے کچھ باغ کا میوہ نذر شہ کو کروں گی
رجھا کر اس سوریجن کوں کنچن کا کھان منگتی ہوں

نویلا لال قادرشاہ اودے گا داد سب میرا
اسی کا پیار بس مجہ کوں، یہی احسان منگتی ہوں

معظم کی ریختی میں جذبات کی گرمی، احساسات کی لطافت، سینے کا گداز اور لب و لہجے کی وہ داخلیت ملتی ہے جس سے ان کی غزل بحیثیت مجموعی محروم ہے۔ سادگی، سلاست، روانی اور رچاؤ کے ساتھ شائستگی، پاکیزگی اور رکھ رکھاو نے اس میں وہ انفرادیت پیدا کر دی ہے جو کہیں اور دیکھنے میں نہیں آتی۔ اُن کی ریختی نہ محمد قلی قطب شاہ کی ریختی ہے اور نہ ہاشمی بیجاپوری کی، بلکہ اس کا اپنا ایک مستقل اور منفرد رنگ ہے اور وہ اس رنگ کے بڑے شاعر ہیں۔

ڈاکٹر حفیظ قتیل نے صوفیانہ ریختیوں کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ "صوفیانہ

ریختیوں کے ان نمونوں سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس صنفِ سخن کا آغاز اپنے اندر کس درجہ مذہبی اصلاح کی عظمت اور روحانیت کی پاکیزگی رکھتا ہے، مگر اس کو کیا کیجیے کہ ارتقا کے آخری روپ میں یہ پارسا بیسوا بن بیٹھی"[1]۔ لیکن شاہ معظم کی ریختی پر یہ الزام عاید نہیں ہوسکتا۔ انھوں نے خانقاہ کی روایت پر آنچ آنے نہیں دی۔

شاہ معظم نے غزل کی ہیئت میں نعت، منقبت اور مدح بھی کہی ہے، یہ سب چیزیں بہ اعتبار ردیف دیوان میں شامل ہیں، نعت کا وہی آہنگ، ہے جو کیں ارض ہوا کیں فلک کتنے، کیں انس ہوا کیں ملک۔ کتنے والی غزل کا ہے :

یوں اپنا اس کوں راج دیا، لولاک کبرا سرتاج دیا
سب امت کی اولاج دیا، یوں جتنا اُس پر پیار کیا
حق مانگا خلقت کرنے کوں اور نعمت لاکر دھرنے کوں
اس دین کو قائم کرنے کوں، یو مظہر دیک انوار کیا
ادراک، عقل، عرفان دیا، فرمان اسے قرآن دیا
سب دھیان دیا اور گیان دیا، یوں حق اس چونسار دیا
بے عیب دیکھو وہ ظاہر ہے، اس کشف دلوں کا ظاہر ہے
سب راز رمز سوں ماہر ہے، تب محرم اُس اسرار کیا
کیا ناٹوں مبارک سرور ہے، سچ حق کا تو وہ دل بر ہے
راہ راست دکھانے رہبر ہے، تب علم لدنی بار کیا

حضرت علی اور حضرت امین کی منقبتیں زیادہ ہیں۔ دوسری منقبتوں میں حضرت غوثِ اعظم، قطب زماں، حضرت قادر لنگا اور حضرت علی پیر کی منقبتیں قابلِ ذکر ہیں۔ ایک منقبت مختلف اولیا کے متعلق ہے۔ بادشاہوں میں صرف عالم گیر کی مدح کی ہے۔

---

[1] ڈاکٹر حفیظ قتیل، دکن میں ریختی کا ارتقا، مشمولہ مجلہ عثمانیہ، دکنی ادب نمبر، صفحہ ۱۴۲



چند نمونے درج ذیل ہیں :

مشکل کشا تو حیدر یا مظہر العجائب ؛ شافع تو روز حشر یا مظہر العجائب
کر مدح تو علی کا، حق کے اتا ولی کا ؛ شاہ سبحنجلی کا یا مظہر العجائب
گنجِ خفی نبی کا ہے تو وصی نبی کا ؛ برحق اخی نبی کا یا مظہر العجائب
اپنا نبی وصی کر، سر پر دھریں ہیں افسر ؛ صاحب تو ہفت کشور یا مظہر العجائب
مکھ چاند سوں منور، معدن تو نورِ انور ؛ ہے تاج توں پیمبر یا مظہر العجائب
مظہر ہوا عجائب، قدرت منے غرائب ؛ ہے توں نبی کا نائب یا مظہر العجائب

---

اے صاحبِ قطب الزماں سایہ ہے تو اللہ کا ؛ اور قرۃ العین نبی مقبول توں درگاہ کا
افسر جو تیرے سراوپر خورشید سوں برتر دسے ؛ مشتاق سب عالم ہوا دیک درس تجہ نو ماہ کا
احوال سب اظہار ہے تیری شجاعت کا دیکھو ؛ یا عقل ہے یا فہم ہے یا سرا ہے آگاہ کا
تیرا ثنا اور صفت سن میرا غزل اور شعر یو ؛ سارے ملک ازبر کریں یو مدح شاہنشاہ کا

---

اے صاحب قطب الزماں سایہ ہے تو سبحان کا ؛ مالک ہے سچ کون و مکاں پیارا ہے تو رحمان کا
نس دن ثنا خوانی ترا کرتا ہوں میں یو جان کر ؛ تو شافعِ روزِ جزا، دے دان مجہ ایمان کا
میثاق سو ہے مجہ اوپر تجہ شاہ کا لطف و کرم ؛ بندہ ہوں میں اس روز سوں تجہ شکر اور احسان کا
جن و ملایک رات دن عاجز ہیں تیرے وصف میں ؛ تیرا مدح کرنے کیتیں کیا ہے سکت انسان کا
قادر تجھے میں جان کر کرتا ہوں سر صدقہ مرا ؛ اے شہ معظم کو اتا سلطان کر گن گیان کا

---

یکایک اس منجالس میں دیکھو دل بر ہوا پیدا ؛ سراسر روپ بدلا کر امیں سرور ہوا پیدا
دنیا کے عیش میں پڑ کر دیکھو سب ہوش بسرے ہیں ؛ وہی پھر راہ دکھلانے امیں رہبر ہوا پیدا

مرا مکتوب سن کر یو حریفاں تو چہ کہتے ہیں ؛ عجائب آج دکھن میں شعر خوشتر ہوا پیدا

---

دکھن اوپر ہو مہرباں بھیجا ہے حق نے قدر داں ؛ عالم پہ ہے اس کی بنا، یوسف کے من بھایا امیں
وحدت کیرے میدان میں کرتا ہے جولا شوق سوں ؛ سر پر مریداں کے تڑے، تیراچہ ہے سایا امیں
شاہ پور، بیجاپور جوں بھرپور ہے تجہ نور سوں ؛ یو سب جہاں روشن ہوا تجہ سو شرف پایا امیں
تجہ لال کسوت میں بدن دستا شفق میں چاند جوں ؛ گویا ازل سوں نور کا تجہ پر سنڈف چھایا امیں

---

مشہور دو جہاں میں برتر ہوا امیں ؛ خورشید سوں منور مظہر ہوا امیں
دیکھو مرید شہ کے کیا قرب دار دستے ؛ سچہ حق اونوں کے اُپر یاور ہوا امیں
شہ کے فقیر دیکھو کہتے خدا نما ہیں ؛ وحدت کے بحر کا چہ شناور ہوا امیں

---

مجھے اس دین دنیا میں وہی یک یار قادر ہے ؛ مرا سچہ یار ہور یاور وہی دل دار قادر ہے
انکھیاں سوں جھانکتا میری زباں سو بولتا آپی ؛ جو کچھ دستا تو میرا میں یو سب آثار قادر ہے
اتا چند روز سوں مجہ کو دیکھو مشرق تے مغرب لگ ؛ ہر یک یک ٹھار دستا مجہ یو سب انوار قادر ہے
یو باتاں گنج مخفی کیاں کیا سب بول عالم پر ؛ نہیں اسراف کچہ میرا یو سب اسرار قادر ہے

---

منور دو عالم علی پیر ہے ؛ سچا پیر ہے ہور سچا میر ہے
وہ برحق نبی کا دسیا جانشیں ؛ علی کا یو فرزند گھنبیر ہے
اسم با مسمیٰ ہے شاہ کا ؛ دیکھو یوچہ دکھن کوں سب دھیر ہے
الٰہی سلامت توں رکھ شاہ کوں ؛ جلک یو زمیں ہور زماں تھیر ہے

---



حق کے کرم اور رحم سوں چھتر ہے عالم گیر کا ؛ پرتو نبی کے نور سوں انبر ہے عالم گیر کا
برحق ولی ہور بادشاہ کہتے جسے ظل الہ ؛ مریخ ... فلک نوکر ہے عالم گیر کا
جس پر کرم خواجہ کیے برحق او زندہ پیر ہے ؛ ہر ٹھار پر اللہ اپیں رہبر ہے عالم گیر کا
پنج وقت کعبے منے کرتا ہے وہ جا کر نماز ؛ قرآن کہتے رات دن دل بر ہے عالم گیر کا

شاہ معظم کو نہ صرف زبان اور بیان پر ہی قدرت حاصل تھی بلکہ اُن کو فن پر بھی بڑی دست رس تھی۔ اُن کے دیوان میں کم و بیش وہ تمام بحریں ملتی ہیں جو مزاج اور آہنگ کے اعتبار سے صنف غزل سے مناسبت رکھتی ہیں۔ علاوہ ازیں انھوں نے بعض تجربے بھی کیے ہیں۔ مثلاً:

عارف کتے معظم کیوں کر پڑا بلا میں ؛ مشہور ہے جہاں پر اُس کا مکر بلا
ہوشیار ہو معظم قادر صبا پوچھے گا ؛ مجہ باج بھی جہاں میں ناحق جیا تو کیا
معشوق سوں ملے لگ عاشق کو کاں صبر ہے ؛ جے کوی ہیں لاابالی کر تیجہ نہیں درنگ

مندرجہ بالا غزلیں بحر مضارع مثمن اخرب سالم میں ہیں، لیکن معظم نے ان غزلوں کے ثانی مصرعوں میں آخری رکن کو سالم کی بجائے محذوف (فاعلن) کر دیا ہے۔ اس طرح ان غزلوں کا وزن یوں ہوگا:

مصرع اول — مفعول فاعلاتن مفعول فاعلاتن
مصرع ثانی — مفعول فاعلاتن مفعول فاعلن

گویا معظم نے بحر مضارع میں ایک نئے آہنگ کا اضافہ کیا ہے۔ اس آہنگ سے ان کی بعض غزلوں کا معنوی حُسن چمک اٹھا ہے۔

انھوں نے مردوف اور غیر مردوف دونوں قسم کی زمینیں استعمال کی ہیں، قافیے اور ردیف کی خوش آہنگی کا، بالعموم، اہتمام کیا ہے اور ریجھانا، بہانا؛ لالا، بالا؛

زنار، دل دار؛ دیا، لیا؛ جانا، پانا؛ دم، غم؛ رخسار، گفتار؛ جاہ، گاہ؛ جلال، جمال؛ جیسے مترنم قوافی برتے ہیں۔ قوافی کے تعلق سے اُن کا یہ وصف خصوصیت کے ساتھ اہمیت رکھتا ہے کہ اُن میں ایک یا ایک سے زیادہ حروف علت ملیں گے۔ جس قافیے میں حرف علت نہیں ہوتا وہ غزل میں ثقیل اور ناخوش گوار محسوس ہوتا ہے۔ شاہ معظم نے اس ثقالت اور ناخوش گوار آہنگ کو روا نہیں رکھا ہے۔ فن کا یہ وہ نازک پہلو ہے، جس کا اہتمام معظم کے اعلیٰ ذوق پر دلالت کرتا ہے۔ اسی طرح انھوں نے دستا، آیا، کرنا، تھا، کا، لگ جیسی مختصر ردیفیں استعمال کی ہیں۔ ردیف کے تعلق سے معظم کے شعورِ فن کا اندازہ اُن غزلوں سے ہوتا ہے، جن میں اُنھوں نے ایسی ردیفیں استعمال کی ہیں، جو اپنے اندر بڑی تجویزیت رکھتی ہیں۔ مثلاً:

اے دل تو اس دنیا میں آکر کیا سو کیا ؛ کرنا سوں توں کیا نیں لئی دن جیا سو کیا
عجائب آج کی شب تھی سجن چونسار آیا تھا ؛ مرے دل کے دلاسے کو ایس دل دار آیا تھا
مرا تو دل بریار ہے پھر کیا کرے گا دیکھنا ؛ اکثر مرا غم خوار ہے پھر کیا کرے کا دیکھنا
ل یار سوں پینا مئے باقی حیات ہے لگ ؛ پینا بھی اور پلانا ساقی یو سات ہے لگ
پیارے کی جدائی سوں مجھے گھر دار نہیں بھاتا ؛ نہ مجھ کو کام خوش لگتا، سگل سنسار نہیں بھاتا
مجھے دل بر کے لب سوں نت پینا جم جام خوش لگتا ؛ بچھڑنا مجھ کوں بھاتا نیں وصل آرام خوش لگتا

اس طرح کی بولتی ہوئی ردیفیں خود غزل کے داخلی لہجے کا تعین کر دیتی ہے اور شعر کا لفظی و معنوی حسن چمک اٹھتا ہے۔

شاہ معظم اگرچہ صنائع بدائع کے دل دادہ نہیں معلوم ہوتے لیکن جہاں کہیں انھوں نے اِن سے کام لیا ہے، نکھرے ہوئے فنی شعور، خوش مذاقی اور قادر کلامی کا ثبوت دیا ہے۔ خصوصاً ترصیع اور مسمط کے برتنے کا انھیں بڑا سلیقہ تھا موخر الذکر کی کئی مثالیں ملاحظہ ہوں:



کیں ارض ہوا، کیں فلک کتے، کیں انس ہوا، کیں ملک کتے
یو دستا اس کا جھلک کتے، اس نور کا سب بستار کیا
کیں نبی ہوا، کیں علی کتے، کیں قطب ہوا کیں ولی کتے
کیں خفی کتے، کیں جلی کتے، یو معنا اپرم پار کیا
کیں ناو ہوا، کیں پرک کتے، کیں دانا کیں مرک کتے
کیں ہندو اور کیں ترک کتے، یو دو جگ پر بار کیا
کیں عاشق کیں معشوق کتے، کیں خالق، کیں مخلوق کتے
کیں منصور، کیں مفتوح کتے، سب چو کا چار کیا

یوں اپنا اُس کوں راج دیا، لولاک کیرا سر تاج دیا
سب امت کی اولاج دیا، یوں جتنا اُس پر پیار کیا
حق مانگا خلقت کرنے کوں اور نعمت لاکر دھرنے کوں
اس دین کو قائم کرنے کوں، یو مظہر دیک انوار کیا
ادراک، عقل، عرفان دیا، فرمان اُسے قران دیا
سب دھیان دیا اور گیان دیا، یوں حق اُس چونسار کیا
کیا ناتوں مبارک سرور ہے، سچہ حق کا تو وہ دل بر ہے
راہ راست دکھانے رہبر ہے، تب علم لدنی بار کیا

یہ صنعت دکھنی شعرا میں بہت مقبول رہی ہے۔

# شرحِ شکارنامہ

حضرت خواجہ بندہ نواز کے فارسی رسائل کا ایک مجموعہ حافظ سید عطا حسین صاحب نے "مجموعۂ یازدہ رسائل" کے نام سے سلسلۂ مطبوعات کتب خانۂ روضتین، گلبرگہ شریف کے تحت شائع کیا تھا، جس میں "برہان العاشقین المعروف بہ قصۂ چہار برادر و مشہور بہ شکارنامہ" بھی شامل ہے۔ یہ رسالہ جس کی حیثیت ایک معمے کی سی ہے، صوفیائے کرام میں بے حد مقبول رہا ہے اور اس کی مختصر و طویل متعدد شرحیں لکھی گئیں، تاکہ اُن مسائل اور مطالب کی وضاحت ہوسکے جو ایمائی انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ "مجموعۂ یازدہ رسائل" میں برہان العاشقین کے متن کے ساتھ سات شرحیں بھی شامل ہیں، جن میں سے چھ اکابرینِ سلف کے قلم سے نکلی ہیں اور ایک حکیم مرزا قاسم علی بیگ، کا نتیجۂ فکر ہے۔ ان اکابرین میں حضرت ابوصالح محمد عرف شیخ حسن محمد چشتی (متوفی ۹۸۲ھ ہجری) میر سید عبدالواحد بلگرامی (متوفی ۱۰۱۷ھ ہجری) حضرت میر سید محمد کالپوی، مولانا محمد رفیع الدین محدث دہلوی کے علاوہ دو ایسے بزرگ بھی ہیں جن کے ناموں کا پتا چل نہ سکا، لیکن ان کے بارے میں یہ بات قطعیت کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ وہ ۱۰۴۸ھ ہجری سے پہلے گزرے ہیں[1] ان میں سے ایک شارح کے متعلق قیاس کیا جاتا ہے کہ غالباً مخدوم سید اکبر حسینی فرزند اکبر حضرت بندہ نواز ہوں گے۔

۱؎ مجموعہ یازدہ رسائل، صفحہ ۱۷



دکھنی شکارنامہ حضرت بندہ نواز کے رسالے برہان العاشقین کا ترجمہ ہے، لیکن قطعیت کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ ترجمہ خود حضرت بندہ نواز نے فرمایا ہے، جیسا کہ بعض حضرات کا قیاس ہے، یا فارسی رسالے کی مقبولیت کے پیش نظر بعد کو کسی اور نے دکھنی میں ترجمہ کردیا، تاکہ وہ لوگ بھی اس سے استفادہ کرسکیں جو فارسی کی استعداد نہیں رکھتے چوں کہ رسالہ بنیادی طور پر حضرت بندہ نواز ہی کا تھا، اس لیے ممکن ہے کہ دکھنی کے مترجم نے اس کو اپنے نام سے منسوب کرنا سوءِ ادب تصور کرکے ترجمے کو بھی حضرت بندہ نواز ہی سے منسوب کردیا ہو یا پھر بعد کو نقل کرنے والوں نے اس خیال سے کہ فارسی کی طرح دکھنی ترجمہ بھی بندہ نواز ہی کا ہوگا، دکھنی ترجمے پر بھی حضرت بندہ نواز کا نام لکھ دیا ہو اور یہی نام چل پڑا ہو۔

فارسی کی طرح دکھنی میں بھی دکھنی شکارنامے کی کئی شرحیں لکھی گئی ہوں گی، لیکن ان میں سے ایک شکارنامے کا جزو لاینفک بن گئی ہے۔ چناں چہ شکارنامے کے جتنے نسخے کتب خانوں اور خانگی ذخیروں میں دیکھنے میں آئے ہیں، اُن سب میں یہ شرح موجود ہے۔ اور اس طرح لکھی گئی ہے کہ بہ ظاہر اصل متن کا جزو معلوم ہوتی ہے۔ دکھنی شکارنامے کے ترجمے کی طرح دکھنی شرح کے شارح کا بھی پتا نہیں چلتا۔

شکارنامہ مع شرح مختلف رسائل تصوف کے ساتھ بمبئی اور مدراس سے کئی بار چھپ چکا ہے، لیکن دکھنی کے محققین نے اس کی طرف ۱۹۶۲ء میں توجہ کی اور عجیب اتفاق ہے کہ اس سال سید مبارزالدین اور ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے اس رسالے کو طویل مقدموں کے ساتھ بہ یک وقت شائع کیا۔ ان دونوں نے بھی شکارنامے کے مصنف اور حضرت بندہ نواز سے اس رسالے کے انتساب کا کوئی ٹھوس ثبوت پیش نہیں کیا ہے بلکہ ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے تو اس مسئلے کو چھیڑنے تک کی ضرورت محسوس نہیں کی ہے۔ اسی طرح شرح کے مصنف کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہا گیا ہے۔

راقم الحروف کا خیال ہے کہ دکھنی ترجمے اور شرح کا مصنف ایک ہی ہوگا۔ تبھی شرح، ترجمے کا جزو لاینفک بنی رہی ہے اور مترجم اور شارح حضرت امین یا انھیں کے خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ ترجمے کا رنگ اور شرح کی تفصیل اسی خانوادے کی تعلیمات پر مبنی ہے۔ چناں چہ شکار نامے سے ملحقہ شرح اور شاہ معظم کی زیرِ تبصرہ شرح کا آہنگ اختلافِ تشریح کے باوجود ایک ہی ہے۔

شاہ معظم کی شرح کا ایک ہی نسخہ (۱۱۴۷ جدید) کتب خانہ آصفیہ میں دست یاب ہوا ہے۔ اس مجموعۂ رسائل کا ذکر جس میں شرحِ شکار نامہ شامل ہے، ہاشمی صاحب کی فہرست میں نہیں ہے۔ میرے کرم فرما مولوی احمد خاں صاحب درویش نے سب سے پہلے اس کا پتا چلایا اور اس سے مجھے واقف کرایا۔ لیکن یہ معلومات کتاب میں شامل ہونے سے پہلے ہی اتنی عام ہوئیں کہ مولوی ہاشمی صاحب مرحوم نے رسالۂ پونم میں ایک مختصر نوٹ شائع کرا دیا اور ابو نصر محمد خالدی صاحب نے پونم کے حوالے کے بغیر رسالۂ قدیم اردو میں ان معلومات کو دہرا دینا ضروری سمجھا۔

شاہ معظم کی اس شرح کی اہمیت یہ ہے کہ یہ شارح کے نام کے تعین کے ساتھ ملتی ہے، لیکن افسوس ہے کہ یہ شرح ناقص الآخر ہے اور غالباً موجودہ متن میں بھی دو ایک جگہ درمیان سے کچھ الفاظ اور چند جملے ساقط ہو گئے ہیں۔

شرح کے آغاز سے پہلے معظم نے لکھا ہے:

"اس شکار نامہ کا شرح فقیر حقیر محمد حسینی معظم قادری اپنے حوصلے موافق فرمائے ہیں۔"

اس وضاحت سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ہم شاہ معظم کے نام سے واقف ہو سکے۔ نام کے اظہار کے بعد وہ شکار نامے کی شرح لکھنے کی وجہ بیان کرتے ہیں۔

"اس واسطے کے یو عاجز اس گھر چشت میں طالب ہوا ہے ہور امین الدین



علی خود کوں سجدہ کیا ہے۔ اون کے تصدق سوں یو فقیر اس راز کو پونچا ہے"

اس تمہید کے بعد شاہ معظم شرح کا آغاز کچھ اس طرح کرتے ہیں جیسے دکھنی شکار نامہ، جس کی وہ شرح لکھ رہے ہیں، حضرت بندہ نواز ہی کی تصنیف ہے:

"نو باپ یعنی حضرت خواجہ حسینی گیسو دراز قدس اللہ سرہ العزیز فرماتے ہیں"

لیکن معظم کے متذکرہ بالا بیان کو بھی اس دعوے کی دلیل نہیں بنایا جا سکتا کہ دکھنی شکار نامہ بندہ نواز کی تصنیف ہے۔ اس لیے کہ فارسی متن بندہ نواز ہی کا ہے۔ نفسِ متن ہو یا اس کا ترجمہ، جب بھی ان مسائل کا ذکر آئے گا جو شکار نامے میں بیان کئے گئے ہیں حضرت بندہ نواز ہی کا نام لیا جائے گا۔ معظم چوں کہ شکار نامے کے انھیں مسائل کی تشریح کر رہے ہیں، اس لیے لازمی طور پر حضرت بندہ نواز ہی کا نام لیں گے۔ اس لیے شرح کے سلسلے میں بندہ نواز کا نام لینے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ دکھنی ترجمہ بھی بندہ نواز ہی کا ہے۔

شرح کا آغاز کرتے ہوئے معظم نے نو باپوں اور سات ماؤں کی جو تشریح کی ہے وہ ان کی جدتِ طبع کا نتیجہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ تشریح شکار نامے سے ملحقہ شرح میں موجود ہے، البتہ چار فرزندوں کی تشریح، انھوں نے چار مراتب وجود سے کی ہے۔ اس کے برخلاف ملحقہ شرح میں چار فرزندوں سے چار نفس (امارہ، لوامہ، مطمئنہ، اور ملہمہ) مراد لیے گئے ہیں۔ چوں کہ معظم نے اس تشریح میں اپنے لیے علاحدہ راستہ نکالا ہے، اس لیے وہ اپنے خیال کی تائید میں شاہ برہان کا حوالہ دیتے ہیں۔

حضرت قدس سرہ قطب الاقطاب شاہ برہان صاحب یوں فرماتے ہیں:

"اس وجود کا محل ہوا یعنی پیدا ابھی ہوا یہانچ ہور رہنگا بی یہانچہ۔"

پھر ان چاروں فرزندوں کو چار بھائی قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں:

"ہور چارو بھائی سو لازم الوجود (عالم شہادت کا وجود جس کے لیے خانوادۂ امینیہ میں واجب الوجود کی اصطلاح عام طور پر استعمال ہوتی ہے)، ممکن الوجود،

ممتنع الوجود ، عارف الوجود ۔

اس سلسلے کی مزید تشریح بھی شاہ معظم کی اپنی ہے :

" ہور تین بھائی ننگے تھے یعنی انو کو وجود نہ تھے جو نظر کی قید میں آویں۔
ہور ایک بھائی کپڑے پھاٹے سو یو وجود نو ٹھار بھاتا ہے ۔ ہور اوس
آستیں میں پیکے تھے یعنے خدا کی محبت ہور عشق اوس وجود میں ہے ۔"

البتہ بازار کی پچیس جنسوں کی تشریح معظم اسی طرح کرتے ہیں ، جس کی صراحت ملحقہ شرح میں ہے ۔

ملحقہ شرح میں چار کمانوں کی تشریح خاک ، پانی ، باد اور آتش سے کی گئی ہے. اس کے برخلاف معظم ان چار کمانوں کو شریعت ، طریقت ، حقیقت اور معرفت سے تعبیر کرتے ہیں اور ان چار منازل کی چار شہادتوں کا ذکر بھی کرتے ہیں.

ملحقہ شرح میں چار تیروں کی صراحت روحِ ملکوتی ، روحِ قدسی ، روحِ سفلی ، اور روحِ علوی سے کی گئی ہے ، لیکن معظم ان سے مراد ذکرِ جلی ، ذکرِ قلبی ، ذکرِ روحی اور ذکرِ سرّی لیتے ہیں ۔

ملحقہ شرح میں چار ہرنوں کی شرح اس طرح کی گئی ہے :

" اول ہرن تن فنا یعنی وجود محمدی ، دوسرا ہرن تن کثیف یعنے محمودی ، تیسرا
ہرن تن بقا یعنی احمدی یو تین ہرن موے ، چوتھا ہرن تن لطیف یعنی احد ذات
حق ہے رُبے چون و بے چگونہ ۔"

معظم کی شرح حسب ذیل ہے :

" چار ہرن سو چار نفس ہیں سو ، نفسِ مطمئنہ ، نفسِ ملہمہ ، نفسِ لوامہ ، نفسِ امارہ ،
انو کوں زیر کرتا سو (عقل) قیاس عقل گمان ، عقل وہم ، عقل آگاہ ۔"

اس کے بعد شکار نامے میں ہرن کے شکار اور اس کے باندھنے کے لیے چار رسیوں



کا ذکر ہے ۔ معظم کی شرح میں اس مقام کی تشریح نہیں ہے ۔ اس کے بعد چار گھروں کا ذکر ہے ۔ ملحقہ شرح میں ان چار گھروں کو شریعت ، طریقت ، حقیقت اور معرفت ٹھہرایا ہے لیکن معظم کے ہاں صرف ایک ہی گھر کا ذکر ملتا ہے ، جس کے ساتھ ہی انھوں نے محراب کی تشریح شروع کر دی ہے ۔ گھر اور محراب دونوں کی تشریح ملحقہ شرح سے مختلف ہے ۔ ملحقہ شرح میں محراب کو حقیقت کا محراب اور قبولیت کا محراب کہا گیا ہے ، لیکن معظم کہتے ہیں :

" ہور خاکی گھر سو یو ہوا جسے قلعہ بولتے ہیں ۔ ہور محراب سو یو تن واجب الوجود ۔
خدائے تعالیٰ نے قرآن میں در سورہ نور خبر دیا ہے ، اللہ نور السموٰت والارض ۔
ہور دل سو حقیقت ، جسے اللہ تعالیٰ نے کہا ہے عرش اللہ تعالیٰ ..... "

معظم کی شرح یہاں ختم ہو جاتی ہے ۔

معظم کی اس شرح سے ان کے تبحرِ علمی ، کمالِ فن اور قوتِ اجتہاد کا اندازہ ہوتا ہے ، اپنی شرح میں انھوں نے ملحقہ شرح سے قدم قدم پر اختلاف کیا ہے اور اپنے لیے الگ راہ نکالی ہے ۔ ان کی شرح اُن فارسی شرحوں سے بھی مختلف ہے جو " یازدہ رسائل " میں شامل ہیں ۔

## منسوبات و مشتبہات

# مثنوی

شاہ معظم کے دیوان مخزونہ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ (نمبر مخطوطہ ۱۷ اردو اوین) کے خاتمے پر ایک ناقص الطرفین مثنوی کے (۳۶) صفحات محفوظ رہ گئے ہیں، جن کے ابیات کی مجموعی تعداد کم و بیش (۴۹۸) ہے۔ چوں کہ مثنوی ناقص الطرفین ہے۔ اس لیے پتا نہیں کہ اس کا نام کیا ہے اور وہ کتنے صفحات اور ابیات پر مشتمل تھی۔ قطعیت کے ساتھ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ اس مثنوی کے مصنف شاہ معظم ہی ہیں۔ اس لیے کہ کوئی داخلی یا خارجی شہادت ایسی دست یاب نہ ہوسکی، جس سے مصنف کے تعین میں مدد ملتی چوں کہ مثنوی دیوان کے خاتمے پر نقل کی گئی ہے، اس لیے قرینہ اسی کا ہے کہ یہ شاہ معظم ہی کی تصنیف ہوگی۔ لیکن یہ قرینہ بھی کم زور ہو جاتا ہے، جب آخری صفحے پر حسب ذیل شعر ملتے ہیں۔

کیا ہے نام میرا لال مشہور ٭ مرا سینا ہے اب لگ داغ ساں دور[۱]
مرا والد زمرو شاہ ہے گا ٭ عدالت کے فلک کا ماہ ہے گا

یہ شعر ماجد کی مثنوی لال و گوہر کے ہیں۔

---

[۱] یہ مصرع اصل میں یوں ہے:
"مرا سینا ہے اصلا داغ سے دور"



ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زیرِ بحث مثنوی کے ساتھ دو ایک صفحات مثنوی لال و گوہر کے بھی شیرازہ بند ہو گئے ہیں۔ ان صفحات کو وجہ سے مثنوی زیرِ بحث بھی مشتبہ ہو جاتی ہے۔ اس لیے اس کا ذکر مشتبہات کے تحت کیا جارہا ہے۔

زیرِ نظر مثنوی ناقص اور نامکمل ہونے کے باوجود زور بیان، ندرتِ اظہار، اسلوبِ نگارش اور بلندیِ تخیل کی وجہ سے کسی بڑے شاعر کا کارنامہ معلوم ہوتی ہے شاہ معظم بنیادی طور پر ایک صوفی شاعر ہیں اور انھوں نے اپنی منظومات میں خانوادۂ امینیہ کی تعلیمات ہی کو نظم کیا ہے، لیکن اس کے باوجود ان کی غیر معمولی شاعرانہ صلاحیتوں کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے۔ اپنی اسی خصوصیت کی وجہ سے وہ خانوادۂ امینیہ کے شعرا میں ممتاز نظر آتے ہیں۔

اس مثنوی میں شاعر نے ایک مثالیہ پیش کیا ہے اور مجرّد تصوّرات کو کرداروں کا روپ عطا کر کے سب رس اور سب رس سے مستفاد مثنویوں کی طرح ایک دل چسپ قصّے کو شاعرانہ انداز اور تیکھے اسلوب میں بیان کیا ہے۔ پوری مثنوی کا خاکہ ہمارے سامنے نہیں ہے، اس لیے اس کی ہیئت، موضوع اور مضامین کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے، تاہم حسبِ ذیل سرخیوں سے کسی حد تک رائے قائم کرنے میں مدد ملتی ہے:

٭ جنگ عشق و عقل باہم ظفر یافتنِ عشق۔
٭ مصاحب کردنِ عشق جنوں را و دیوانہ شدن و سر بہ صحرا زدن۔
٭ فرستادنِ حسن ترحم را و آمدن عشق بہ شہر و بہ حمام رفتن و مئے نوشیدن۔
٭ نامہ نوشتنِ عشق بہ حسن و جواب نامہ نوشتن حسن بہ عشق۔
٭ رقعہ خواستگاری نوشتنِ عشق بہ عصمت بی بی مادر حسن۔
٭ عروسیِ عشق و حسن و کیفیت عروسی۔

مثنوی کا اسلوب بیان وہی ہے جو وجہی نے سب رس میں اختیار کیا ہے۔ جس طرح وجہی نے حسن، دل، عشق، عقل وغیرہ کو کرداروں کا روپ دے کر ان کے عمل سے قصے کا تانا بانا تیار کیا ہے، اسی طرح اس مثنوی میں بھی عشق، عقل، حسن، جنون اور عصمت وغیرہ کو کرداروں کی حیثیت دے کر ان کے عمل سے قصے کا بیرنگ تیار کیا گیا ہے، اگر یہ پوری مثنوی دست یاب ہوتی تو یقیناً دکھنی شاعری میں ایک کامیاب مثنوی کا اضافہ ہوتا، لیکن افسوس ہے کہ تلاش کے باوجود کسی کتب خانے یا خانگی ذخیرے میں اس کے کسی دوسرے نسخے کا پتا نہ چل سکا۔

مولوی عبدالحق نے اپنے مضمون "سب رس" میں لکھا ہے کہ دکن کے چار شاعروں نے بھی اس قصے کو اپنی زبان میں بیان کیا اور چاروں منظوم ہیں۔ ان میں ایک شاہ حسین ذوقی ہیں۔ جن کی نظم کا نام وصال العاشقین ہے اور سنہ تصنیف سنہ ۱۱۰۹ ہجری ہے۔ دوسرے بیر اللہ شاہ مجرمی ہیں جنھوں نے سنہ ۱۱۸۶ ہجری میں گلشن حسن و دل کے نام سے اس قصے کو نظم کا جامہ پہنایا ہے اور تیسرے سید محمد ولی اللہ قادری ہیں جن کی نظم کا عنوان "سب رس" ہے۔ چوتھے شاعر کے نام کا پتا نہ چل سکا۔ مثنوی کا نام "حسن و دل" ہے۔ اس کے دو نسخے مولوی صاحب مرحوم کے یہاں تھے لیکن یہ دونوں ناقص ہیں۔[1]

مولوی صاحب نے تینوں مثنویوں کے نمونے بھی نقل کیے ہیں اور وصال العاشقین مصنفہ سید شاہ حسین ذوقی اور گلشن حسن و دل مصنفہ مجرمی پر علاحدہ مضامین بھی لکھے ہیں[2] لیکن آخری مثنوی کا کوئی نمونہ نہیں دیا ہے، ممکن ہے کہ یہ زیر نظر مثنوی ہی کا دوسرا نسخہ ہو۔

اس ناقص الطرفین مثنوی کا آغاز حسب ذیل اشعار سے ہوتا ہے:

۱؎ مولوی عبدالحق، رسالہ اردو، بابت ماہ اکتوبر ۱۹۲۴ء

۲؎ مولوی عبدالحق، رسالہ اردو، بابت ماہ جولائی ۱۹۲۵ء



زبس دو مضامیں منور رسا ؎ نشہ میں بھنتر سوں دویا ہر دسا
جب اس نے دہن کھول قلقل کیا ؎ اپس کوں خوش آہنگ بلبل کیا
خوش اندام حق نے بنایا اوسے ؎ نزاکت کے کپڑے پنھایا اسے
شراب اس میں تھا شربت گیان کا ؎ عرق تھا دو یاقوت کے کھان کا

اس کے بعد "جنگ عشق و عقل باہم ظفر یافتن عشق" کی سرخی کے تحت عقل کی بڑائی کی ہے اور پھر عقل اور عشق کی معرکہ آرائی کا ذکر چھیڑا ہے۔ عقل کے متعلق ابتدا میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ بڑے بلیغ اور فلسفیانہ ہیں اور یہ خیالات اقبال کے تصور عقل سے اس قدر قریب ہیں کہ اقبال کے حسب ذیل شعر کی تفسیر معلوم ہوتے ہیں۔

عقل گو آستاں سے دور نہیں ؎ اس کی تقدیر میں حضور نہیں

دکھنی شاعر کہتا ہے:

عقل جس سوں پاتا ہے انساں تمیز ؎ اگرچہ بڑی چیز ہے اے عزیز
وہی گھر منے معرفت کا دیوا ؎ عقل خود شناسی کوں لازم ہوا
کہ تا خوب سمجھے کہ ہوں کون میں ؎ کہاں سو چل آیا ہوں دنیا کتیں
براں ہو کے آیا ہوں کس کام سوں ؎ کہاں یہاں سو جاؤں گا انجام کوں
ولے عقل اکثر دیکھا یوں کیا ؎ کہ نیں اس کے تیں عشق اوپر دیا

عقل بڑی چیز ہے۔ اسی سے انسان میں تمیز اور خود شناسی پیدا ہوتی ہے۔ معرفت کے گھر میں وہ ایک روشن چراغ ہے۔ وہی انسان کو اپنے متعلق ان بنیادی سوالات کے جواب کی تلاش پر مجبور کرتی ہے جو آغازِ آفرینش سے آج تک اس کو پریشان کیے ہوئے ہیں، یعنی میں کون ہوں؟ کہاں سے آیا ہوں؟ کیوں آیا ہوں؟ اور کہاں جانے والا ہوں؟

ان خیالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر عام صوفیا کے برخلاف عقل و شعور کی

کارفرمائی اور معرفتِ حق کی راہ میں اس کی رہنمائی اور افادیت کے تعلق سے کس قدر متوازن رائے رکھتا ہے، لیکن اقبال کی طرح اس کو بھی اعتراف ہے کہ عقل کے پاس عشق کا دیا نہیں ہے۔ اس لیے اس کی تگ و دو ایک خاص مقام پر رک جاتی ہے۔ اس کے آگے اس کو کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں عقل کو عشق کے چراغ کی ضرورت ہوتی ہے۔

شاہ معظم نے "گفتارِ عقل و عشق" میں عقل کی فضیلت اور اہمیت کو تسلیم کیا ہے لیکن زیرِ نظر اشعار میں شاعر کا نقطۂ نظر زیادہ واضح اور فلسفیانہ ہے۔

عقل کی بڑائی کرنے کے بعد عقل اور عشق کی ازلی آویزش کی طرف اشارہ کیا ہے:

اندیشے کے فوجاں بھجاتا ہے نت ÷ جنوں کا منافق کہواتا ہے نت
عشق میں ہے آفت وو خانہ خراب ÷ عشق کا جگر اوس کے ہاتاں کباب
ولے عشق کی قدر دھرتا نہیں ÷ عشق کے جنوں کن ٹھہرتا نہیں

اس کے بعد عقل اور عشق کی معرکہ آرائی کا نقشہ کھینچا ہے۔ کہتا ہے کہ جب عقل کو معلوم ہوا کہ حسن اور عشق رنگ رلیاں منا رہے ہیں تو اس کے دل پر سانپ لوٹ گیا اور اس نے رنگ میں بھنگ ڈالنے کے لیے عشق پر فوج کشی کا ارادہ کیا۔ سپاہ دارِ لشکر اور محاسب دفتر کو طلب کر کے ایک بڑا لشکر تیار کرنے کا حکم دیا۔ سپہ دارِ لشکر کا نام اندیشہ اور اس کے بیٹے کا نام وسواس ہے:

فوج کی ترتیب کا ذکر اس طرح کرتا ہے:

عقل آپ تھا قلبِ لشکر منے ÷ ہراول کیا ہوش مرزا اُنے
طرف راست تھا فہم خان دلیر ÷ طرف چپ اتھا دانش آقائے شیر
فراست ملک بھی چنداول ہوا ÷ اسی قسم لشکر مکمل ہوا
چلا یوں عقل حیرت آباد کوں ÷ چڑھا عشق اوپر فوج بیدار کوں

عشق کو اس بلائے ناگہانی کی خبر نہ تھی اور وہ حسن کے ساتھ دادِ عیش دے رہا تھا۔



صبح سویرے جب مرغِ بسمل سحر نے نالے کے پر کھولے، سورج کا رنگین پھول روشن ہوا۔ پھولوں کے دل باغ باغ ہو گئے، آسماں نے رات کی زلفیں سمیٹیں اور ساری دنیا نور میں نہا گئی تو خیال نے عشق کے ہاں جاسوس روانہ کیا اور اطلاع دی کہ یہ دن رات کا عیش و عشرت کب تک، عقل ہمارے ملک پر چڑھ آیا ہے۔ جنگ کی تیاری ضروری ہے۔ عشق کو اس آفتِ ناگہانی کی اطلاع ملی تو غصے سے سرخ ہو گیا۔ لشکر کو تیاری کا حکم دیا، حسن کو بھیگی نظروں سے وداع کیا اور کمرِ ہمت باندھ کر "سپہ دارِ لشکر جنوں خاں شیر" کے ساتھ حیرت آباد سے روانہ ہوا۔ ہراول کی کمان بے خودی بیگ کے ہاتھ میں تھی۔ میمنے کی رہنمائی مسرت آقا کے ذمے تھی اور میسرہ درد بیگ کے تحت تھا۔

بالآخر عقل اور عشق کی فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ بڑے معرکے کا رن پڑا۔ گرد و غبار کا یہ عالم تھا کہ آسمان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سیاہ بادل چھا گئے ہیں۔ اس تاریکی میں تلواریں بجلی کی طرح چمکتی تھیں۔ ہر طرف خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں اور ان میں انسانی جسم تیرتے پھرتے تھے۔ موت، سراسیمہ اور حیران تھی۔ نقارے زندگی پر ماتم کر رہے تھے۔ غرض ایک قیامت برپا تھی۔

یکایک عقل کی فوج منتشر ہونے لگی، بے خودی نے جب ہلّہ کیا تو سپہ دارِ عقل اندیشہ واویلا کرنے لگا، ہوش مرزا بھاگ کھڑا ہوا، فہم خاں اور فراست ملک کا کہیں پتا نہ تھا۔

غرض عقل بھاگا بہ بے حال سوں ÷ عشق فتح پایا ہے اقبال سوں

متذکرہ بالا جائزے سے مثنوی کے ایک مرقعے کے خط و خال اجاگر ہو جاتے ہیں، جو بڑے تیکھے ہیں۔ ان چند اشعار سے بھی مثنوی کی اٹھان کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ طوالت سے بچنے کے لیے دوسرے عنوانات کا تفصیلی جائزہ لینے کی بجائے کچھ اشعار نقل

کیے جاتے ہیں:

## مصاحب کردن عشق جنوں را و دیوانہ شدن و سر بہ صحرا زدن

جنوں جو عشق کا سپہ دار اچھے ÷ عشق کوں وو رسوا کرنہار اچھے
ہر ایک باٹ وحشی بیگانا ہے وو ÷ نڈر ہے، بلا ہے، دیوانا ہے وو
فلاطوں کے دل میں اگر جا کرے ÷ گنوا عقل اس کوں دیوانا کرے
دو عالم کے فکر اس بھلاتا ہے وو ÷ چلا شہر جنگل دیکھاتا ہے وو
عقل پر وو کس روز کھوڑا نہیں ÷ بغیر از جنوں عشق پورا نہیں
غمِ دنیوی کا وو خوں خوار ہے ÷ تکلف کے پیشے سوں بیزار ہے
جو عاشق پرت میں دیوانا اچھے ÷ مرے تو اگے وو چ دانا اچھے

---

جنوں نے جو اتنا کیا دھوم دھام ÷ عشق نے گنوایا سگل نیک و نام
بدن پر کیا پیرہن چاک اونے ÷ بچھونا کیا دامنِ خاک اونے
حسن کے اندیشے میں مرنے لگا ÷ یہی ناؤں تسبیح کرنے لگا
اسی حال رسوا ہو عالم منے ÷ لیا حیرت آباد کی راہ اونے
ہوا نا امید آہ مارن لگیا ÷ لے کر نام پیو کا پکارن لگیا
گلیاں میں وہ پھرنے لگا روز و شب ÷ ہوے دیکھ اسے دوست دشمن عجب
کبھی لب کے تیں کھول کرتا گماں ÷ پہنچتے تھے نالے کے تیر آسماں
کبھی زلف کی یاد سوں دود آہ ÷ نکالا ہے بولا مرے دن سیاہ
کبھی راگ کے تان بھرنے لگا ÷ کبھی شعرِ جاں سوز پڑھنے لگا
ہر یک راگ کیان جنوں کا بیاں ÷ بھتر سوں کرے لھو کے چشمے رواں



کہیں وو کھڑا اچھکو گریاں دسا ÷ کہیں دیکھ حالت کوں اپنے ہنسا
اپس ہات وحشت کا دامن لیا ÷ جنگل بیچ جا کر ٹھکانا کیا

## فرستادنِ حسن ترحم را و آمدنِ عشق بہ شہر و بہ حمام رفتن و مے نوشیدن

سنیا دل کے بلبل سوں میں یو سدا ÷ پرت کا گلستاں ہے رنگین سدا
پرت کا بیاں (میں) کہوں کس کنے ÷ کشش ہے وہ معشوق و عاشق منے
اگرچہ خدا سب پو قادر اچھے ÷ وفادار محبوب نادر اچھے
جسے نیک طالع بنایا ہے حق ÷ وفادار پیو اوس ملایا ہے حق

## نامہ نوشتنِ عشق بہ حسن و جوابِ نامہ نوشتن حسن بہ عشق

ارے قاصد آشوق کا کر علاج ÷ کہ دھرتا ہوں تج سوں اتا احتیاج
کتابت لیجا پیو کنے دمبدم ÷ شتابی ستے آ مبارک قدم
یو دکھنی کتابت کی زنجیر میں ÷ مضامینِ حرماں کی زنجیر میں
قلم کچھ عجائب گہر ریز ہے ÷ کہ صفحے پو تیرے تمن تیز ہے
دوات انجوؤں کا تو چشماں ہوا ÷ کہ ظلمات کا وو کرشماں ہوا
اتا سبز ہوتا بچن لب منے ÷ معانے کا ریشا مرکب منے

## رقعۂ خواستگاری نوشتن بہ عصمت بی بی مادرِ حسن

جو عاشق وصل کا ہے امیدوار ÷ اس آگے بلا ہے بڑی انتظار
ہر یک تل اس عالم میں یک سال ہے ÷ کہ حسرت سوں دل کا برا حال ہے
خصوصاً جو قاصد کوں بھیجا اچھے ÷ پھر آنے تلک کیا کلیجا اچھے

ولے خوش خبر لے جو قاصد پھرے ۞ تو شادی سوں غم کوں مبدل کرے

## عروسی عشق و حسن وکیفیت عروسی

اگرچہ محبت ہے اول بلا ۞ کہ کرتی بلایاں سوں دل مبتلا
دلوں میں جنوں کا سبو در سبو ۞ انجو کر نکالے جگر کا لہو
ولے عاقبت مہربانی کرے ۞ خوشی دے کے دل کامرانی کرے





# وجود العارفین

شاہ معظم شاعر ہی نہیں نثر نگار بھی تھے۔ اُن کے نثری رسالے شرح شکار نامہ کا ذکر ہو چکا ہے۔ اُن سے نثر کا ایک اور رسالہ بھی منسوب کیا جاتا ہے، جس کا نام وجود العارفین ہے، لیکن یہ انتساب مشتبہ ہے۔ اس لیے کہ اس رسالے کے بعض نسخوں پر علی پیر اور شاہ برہان الدین رازِ الٰہی کے نام بھی ملتے ہیں۔ ان سب نسخوں کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

### ۱۔ کتب خانہ نواب سالار جنگ، حیدر آباد

مخطوطہ نمبر (۱۷۲ تصوف)، تعداد صفحات (۴۰)۔

یہ نسخہ شاہ معظم کی منظومات شجرۃ الاتقیا، گلزارِ چشت اور آزاد نامہ وغیرہ کے ساتھ ایک ہی جلد میں تھا، لیکن اب ان تمام رسالوں کی علاحدہ جلد بندی کردی گئی ہے۔ یہ تمام رسالے دیسی کاغذ پر خط ثلث میں لکھے ہوئے ہیں۔ زیرِ نظر نسخے کی لوح پر کوئی عبارت ہے اور نہ ترقیمہ ہی ہے، جس سے مصنف کا پتا چلتا۔ ہاشمی مرحوم نے مصنف کا نام معظم بتایا ہے۔[۱] لیکن کوئی شہادت ایسی نہیں ملتی جس سے اس انتساب کی توثیق ہو سکے، سوائے اس کے کہ یہ رسالہ شاہ معظم کی منظومات کے ساتھ

۱۔ نصیر الدین ہاشمی، نواب سالار جنگ کی اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست، صفحہ ۲۰۲

مجلد تھا اور ان سب کا کاتب ایک ہی ہے۔ کاتب نے اپنا نام اور کتابت کے مکمل
ہونے کی تاریخ و دن، وقت اور مہینہ گلزار بہشت کے خاتمے پر لکھا ہے۔ سنہ نہیں
لکھا ہے:

تمت تمام شد تحریر فی التاریخ نہم ماہ ربیع الآخر (ربیع الآخر) روز جمع
(جمعہ) وقت دوپہار (دوپہر) انصرام رسید از خط خام سید جعفر
باشیبان۔

رسالے کے آغاز سے پہلے کے صفحے پر متن کے قلم سے مختلف قلم سے "این وجودی
رسالہ است" لکھا ہے۔ بسم اللہ سے پہلے ایک مہر ہے جو صاف نہیں ہے، تاہم سید
محمد جعفر حسینی پڑھا جاتا ہے۔

**آغاز:**

اے عارف خدائے تعالیٰ قرآن میں فرمایا ہے کہ کل شیٔ محیط وفی انفسکم
افلا تبصرون وھو معکم اینما کنتم ونحن اقرب الیہ من حبل الورید۔
فاینما تولوا فثم وجہ اللہ ومن کان فی ھذہٖ اعمیٰ وھو فی الآخرۃ اعمیٰ واضل
سبیلا۔ اس واسطے ضرور ہوا کہ کچھ معرفت حق کا بولنا، جوں اپس کو سمجھا گیا
تیوں۔ قال علیہ السلام تکلم الناس علیٰ قدر عقولھم۔ یعنی آدمی بات
کرتا ہے اپنی عقل موافق۔

وجود العارفین ہے (ناؤں؟) اوس کا
وہی پاوے نصیب ہو خوب جس کا
جو کوئی پیر کامل سوں یہ دیکھے
علی اوس کا متاع ہے نیں ہے کس کا



**خاتمہ:**

باتاں تے کچھ کاج نہیں اے کرنی کچھ یک سار
کرنی تے کچھ پھل نہیں بن لوڑے سوجن ہار
جب لگ دیا فرصت الٰہی نہ غفلت گھال یسار
انصاف باقی شاہد ہونا بندہ فعل مختار
تمت تمام شد

## ۲۔ کتب خانۂ ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد

مخطوطہ نمبر (۱۱۱۸)، تعداد صفحات (۲۴)

لوح پر "رسالۂ وجود العارفین من تصنیف حضرت خواجہ بحور انوار حضرت علی پیر صاحب"
لکھا ہے۔ ڈاکٹر زور نے بھی مصنف کا نام علی پیر ہی بتایا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ رسالے
کا نام وجود العارفین، حضرت بندہ نواز کے رسالے وجود العاشقین کی تقلید میں رکھا ہے[۵۱]
کوئی ترقیمہ نہیں ہے۔

## ۳۔ کتب خانۂ آصفیہ، حیدرآباد

مخطوطہ نمبر (۳۵/۷، تصوف)، تعداد صفحات (۹)

یہ نسخہ ناقص الاول وناقص الآخر ہے۔ آغاز اس طرح ہوتا ہے:
آدمی سیں بات کرو اوس کے عقل موافق۔ رباعی (قطعہ)

وجود العارفین ہے ناؤں اس کا ٭ وہی پاوے نصیب ہے خوب جس کا
جو کوئی پیر کامل سوں یو دیکھے ٭ علی اوس کا متاع ہے نیں بھی کس کا

اختتام کی عبارت یہ ہے۔

---

۵۱۔ ڈاکٹر زور، تذکرہ مخطوطات ادارہ ادبیات اردو، جلد پنجم، صفحہ ۲۸۲

مرنے کے آگے مرنا تو وو کیوں مرنا ، یعنے اس پانچہ حواس کے لذتاں سوں گزرنا تو جانو یو تن اس تے چھوٹا ......

ہاشمی مرحوم نے مصنف کا نام علی پیر لکھا ہے اور سنہ تصنیف کسی حوالے کے بغیر سنہ ۱۱۲۵ ہجری بتایا ہے۔[1]

۴ ۔ کتب خانۂ آصفیہ ، حیدر آباد

مخطوطہ نمبر ( ۴۵ شاملات ) ، تعداد صفحات ( ۹ )

لوح پر کوئی عبارت نہیں ہے ، البتہ ترقیمے میں مصنف اور رسالے کا نام لکھا ہے:

"ایں رسالہ وجود العارفین من تصنیف حضرت پیر صاحب علی ۔ کاتب الحروف غلامانِ غلام خاک پائے درویشاں شاہ نظر علی بنگالی القادری شطاری تمت تمام شد۔"

ہاشمی مرحوم نے اس نسخے کے تعارف میں لکھا ہے :

اس نام کی فارسی کتاب ادارہ ادبیات اردو میں موجود ہے ۔ کتب خانۂ سالار جنگ میں اسی نام کی کتاب معظم کی مصنفہ ہے۔[2]

رسالے کا نام ترجمۂ وجود العارفین ، مصنف کا نام علی پیر اور سنۂ تصنیف اوائل سنہ ۱۲۰۰ ہجری بتایا ہے ۔[3]

۵ ۔ کتب خانۂ آصفیہ ، حیدر آباد

مخطوطہ نمبر ( ۸۱۷ تصوف ، تعداد صفحات ( ۳۰ )

لوح پر" رسالۂ وجودیہ تصنیف شاہ برہان الدین قادری سنہ ۱۶۹۵ نشان سلسلۂ فہرست

---

[1] فہرست مخطوطات کتب خانۂ آصفیہ جلد دوم صفحہ ۲۰۷

[2] فہرست مخطوطات کتب خانۂ آصفیہ ، جلد دوم ، صفحہ ۲۵۳

[3] فہرست مخطوطات کتب خانۂ آصفیہ ، جلد دوم ، صفحہ ۲۵۳



حکیم محب حسین" لکھا ہے ، لیکن یہ تحریر متن کے قلم سے مختلف اور بہت بعد کی ہے ۔ ترقیمہ حسب ذیل ہے :

"ایں رسالہ وجودیہ تصنیف جناب حضرت سید شاہ برہان الدین قادری رازِ الٰہی ۔ ایں نوشت محمود خاں"۔

ترقیمہ بھی متن کے قلم سے مختلف ہے لیکن لوح کی عبارت سے پرانا معلوم ہوتا ہے۔

اس نسخے میں بھی وہ قطعہ موجود ہے ، جس میں رسالے کا نام وجود العارفین اور علی تخلص آیا ہے ۔ ہاشمی صاحب نے مصنف کا نام شاہ برہان الدین قادری راز الٰہی لکھا ہے اور سنہ تصنیف قبل سنہ ۱۱۰۰ ہجری بتایا ہے ۔[1]

اس نسخے کا خاتمہ متذکرہ بالا نسخوں سے مختلف ہے :

"اپنے میں رہ کر سلوک تے یک لحظہ بھی خالی نا رہنا ۔ خلوت در انجمن سو جو مجلس میں لوگاں کے ساتھ مل بیٹھ کر یاد کرتے رہنا اور خدا کی یاد نہ بھولنا ، پس منگتا نفس ، دل جانتا ، روح دیکھنا ۔ تمام شد"۔

تمت تمام شد کے باوجود یہ نسخہ ناقص الآخر ہے اور آخری دو صفحات کی عبارت کسی اور رسالے کی معلوم ہوتی ہے ۔

۶ ۔ کتب خانۂ آصفیہ ، حیدر آباد ۔

مخطوطہ نمبر ( ۱۸۶۷ تصوف ) ، تعداد صفحات ( ۱۴ )

یہ نسخہ ایک اور رسالے کے ساتھ شامل ہے ، جس کا نام جام جہاں نما ہے ۔ ابتدائی صفحے کی لوح پر جام جہاں نما" لکھا ہے ، لیکن اس عنوان کے تحت جو رسالہ نقل کیا گیا ہے وہ وجود العارفین ہے ۔ ترقیمے میں رسالے کا نام رسالہ واجب الوجود بتایا گیا ہے ۔ اس رسالے کے خاتمے پر صابر کا کلام ، ایک دائرہ اور پھر حافظ اور صابر کا کلام ہے۔

---

[1] نصیر الدین ہاشمی ، فہرست مخطوطات کتب خانۂ آصفیہ ، جلد دوم ، صفحہ ۲۱۲

اگلے صفحے پر ایک دائرہ اور اصطلاحات کی تشریح ہے، جس کے بعد نئے صفحے سے ایک رسالہ شروع ہوتا ہے۔ غالباً یہ جامِ جہاں نما ہے

اس نسخے پر مصنف کا نام درج نہیں ہے، اس لیے ہاشمی مرحوم نے مصنف نامعلوم لکھا ہے [1]

ترقیمہ حسب ذیل ہے:

"یہ رسالہ واجب الوجود کا دسویں تاریخ ربیع الاول سنہ ۱۲۰۶ ہجری ہاتھ سے احقر قاسم خاں کے تمام ہوا"۔

خاتمے پر باجن کا ایک شعر درج ہے:

کہنے میں تو بھاؤں نا اپڑے جس کا سو ہے جانے
باجن چاکے جس کا چکا چاکیا ہوئے سو جانے

۷۔ کتب خانۂ انجمن ترقی اردو، ہند، دہلی

مخطوطہ نمبر (۵۲ تصوف)

یہ نسخہ اس مجموعے میں شامل ہے، جس میں شاہ تراب کی گیان سروپ، من سمجھاون، کلام بادشاہ حسینی وغیرہ نقل کیے گئے ہیں۔ اس نسخے میں علی تخلص والا قطعہ نہیں ہے۔ لوح پر رسالے کا نام وجودیہ لکھا ہے۔ مصنف کا نام کہیں درج نہیں ہے

۸۔ نسخہ مملوکہ عبداللہ صاحب مرحوم

ہاشمی مرحوم نے دکن میں اردو میں حضرت امین کی نثری تصانیف کے خاتمے پر لکھا ہے:

اسی عہد کے دو اور رسالوں کا پتہ چلا ہے جو نثر میں لکھے گئے ہیں، لیکن ان کے

---

[1] نصیر الدین ہاشمی، فہرست مخطوطات کتب خانۂ آصفیہ، جلد دوم، صفحہ ۲۴۲



مصنف کا نام معلوم نہیں ہوتا مگر مخطوطے کی اندرونی شہادتوں سے پتا چلتا ہے کہ یہ اسی زمانے کی تالیف ہے [1]

ان میں سے ایک رسالے کا جو نمونہ انھوں نے اپنے پھوپا عبداللہ صاحب مرحوم کی مملوکہ بیاض سے نقل کیا ہے وہ وجود العارفین ہی کا ابتدائی حصہ ہے۔ یہ نسخہ راقم الحروف کو دستیاب نہ ہوسکا۔ ہاشمی مرحوم کا بیان تھا کہ عبداللہ صاحب کے انتقال کے بعد یہ نسخہ کہیں گم ہوگیا ہے۔

۹۔ کتب خانۂ انجمن ترقی اردو، پاکستان۔

تعداد صفحات (۵۱)، خط ثلث۔

آغاز:

اے عارف خدائے تعالیٰ قرآن میں فرمایا ہے کہ کل شیءٍ محیط و افضل مبیلا۔ اس واسطے ضرور ہوا کہ کچھ معرفت حق کا بولنا، جیوں اپس کوں سمجا گیا تیوں۔

اختتام:

فاینما تولوا فثم وجہ اللہ

باتاں تے کچھ کاج نہیں رے کرنے کچھ یک سار
کرنے (کرنی) تے کچھ پھل نہیں بن تو ڑے سرجن ہار (پھل کچھ)
جب لگ دیا فرصت الٰہی نہ غفلت کہاں رکھا لام بسار (کذا) (گھال بساو)
انصاف باقی شاہد ہونا بندہ فعل مختار

تمت تمام شد کار بن نظام شد

وہ قطعہ بھی موجود ہے، جس میں علی پیشہ کا تخلص اور رسالے کا نام وجود العارفین

---

[1] نصیر الدین ہاشمی، دکن میں اردو (چھٹی اشاعت)، صفحہ ۲۵۵

آیا ہے۔[۵۱]

افسر صدیقی نے اپنے مضمون "سی حرفی معظم" مطبوعہ رسالہ اردو، کراچی، بابت اپریل/ ۶۶ ۱۹ء میں شاہ معظم کی تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کتب خانہ خاص مولوی عبدالحق میں وجود العارفین کا ایک نسخہ ہے، جس کی لوح پر "ایں وجود العارفین گفتار حضرت پیر دستگیر علی ابن حضرت شاہ باباحسینی ابن شاہ امین الدین علیؒ درج ہے۔

کتب خانۂ ادارہ ادبیات اردو میں ایک رسالہ نمبر (۱۰۲۳) پر ہے جس کی لوح پر "وجود یہ تصنیف علی صاحب ابن باواشا صاحب قدس سرہ" درج ہے۔ اس رسالے کی ابتدائی چند سطریں وجود العارفین ہی کی ہیں لیکن اس کے بعد پورا رسالہ مختلف ہے۔ آخر میں لکھا ہے "یہ تلاوت الوجود سالکان و عاشقاں محبوب را تسلی نماید۔ انشاءاللہ تعالیٰ. تصنیف سید ابوالفتح صدرالدین خواجہ خواجگاں مخدوم سید محمد حسینی بندہ نواز گیسودراز عاشق شہباز سرانوار خاک و بانیاز قدس سرہ۔"

ڈاکٹر زور نے اسی عبارت کے پیش نظر لکھا ہے کہ "اس مخطوطے کی آخری عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا نام تلاوت الوجود ہے اور یہ غالباً بندہ نواز کے فارسی رسالے کا اردو ترجمہ ہے۔" اور اس رسالے کو تلاوت الوجود ہی کے نام سے متعارف کرایا ہے۔[۵۲]

یہ دراصل تلاوت الوجود مصنفہ شاہ مخدوم حسینی مرید و خلیفہ پیر اللہ حسینی کا ایک نسخہ ہے، جس کے آغاز میں کاتب نے وجود العارفین کی چند سطریں نقل کر دی ہیں۔ تلاوت الوجود کے اکثر کاتبوں کی طرح اس نسخے کے کاتب کو بھی شاہ مخدوم حسینی کے نام سے غلط فہمی ہوئی ہے اور اس نے اس رسالے کو بندہ نواز کی تصنیف خیال کر کے انھیں کا نام لکھ دیا ہے۔ حالاں کہ متن میں شاہ مخدوم نے ایک جگہ اشعار میں اپنے پیر کا

---

۵۱ افسر صدیقی، فہرست مخطوطات انجمن ترقی اردو پاکستان، جلد دوم، صفحہ ۲۴۹

۵۲ ڈاکٹر زور، تذکرہ مخطوطات ادارہ ادبیات اردو، جلد پنجم، صفحہ ۱۸۳



ذکر کیا ہے۔

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے وجود العارفین کے دو نسخوں کا ذکر اپنی کتاب اردو نثر کا آغاز و ارتقا میں کیا ہے اور دکن میں اردو کے حوالے سے اس کو حضرت امین کی[۵۱] اور نسخہ نمبر (۸۱۷ تصوف) کتب خانہ آصفیہ کے حوالے سے شاہ برہان الدین راز الٰہی کی تصنیف بتایا ہے۔[۵۲] موخرالذکر انتساب کی وجہ تو سمجھ میں آتی ہے، اس لیے کہ نسخہ نمبر (۸۱۷) تصوف، کتب خانہ آصفیہ پر راز الٰہی کا نام لکھا ہے لیکن اول الذکر انتساب کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ اس لیے کہ ہاشمی مرحوم نے صراحتاً لکھا ہے کہ اس رسالے کے مصنف کا نام معلوم نہ ہو سکا۔[۵۳]

زیرِ نظر رسالے کے (۱۰) نسخوں میں سے (۶) پر مصنف کا نام درج نہیں ہے، تین پر علی پیر کا اور ایک پر شاہ برہان الدین رازِ الٰہی کا نام ہے۔ جہاں تک شاہ برہان الدین رازِ الٰہی کے نام کا تعلق ہے، راقم الحروف کا خیال ہے کہ یہ نام کاتب نے نہیں لکھا ہے بلکہ بعد میں کسی نے بڑھا دیا ہے۔

راقم کی نظر سے اس رسالے کے سات نسخے گزرے ہیں۔ ان میں سوائے انجمن کے نسخے کے ہر نسخے میں پانچ عناصر، پچیس گن کا ذکر ملتا ہے اور یہ حضرت امین کی تعلیمات ہیں۔ رازِ الٰہی خانوادۂ قادریہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے نظامِ تصوف میں پانچ عناصر پچیس گن کی تعلیمات کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ وہ حضرت امین کے ہم عصر ضرور تھے اور ہم عصر ایک دوسرے سے متاثر بھی ہوتے ہیں لیکن ہمارے ہاں ایسا کوئی

---

۵۱ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، اردو نثر کا آغاز و ارتقا، صفحہ ۱۹۷

۵۲ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، اردو نثر کا آغاز و ارتقا، صفحہ ۲۲۰

۵۳ نصیر الدین ہاشمی، دکن میں اردو، (چھٹی اشاعت) صفحہ ۲۷۵

ثبوت نہیں ہے، جس کی بنیاد پر کہا جا سکے کہ راز الٰہی حضرت امین کے نظامِ تصوف سے متاثر تھے۔

زیرِ نظر رسالے میں جگہ جگہ شاہ برہان کا نام آیا ہے اور اُن کے اشعار سے استدلال کیا گیا ہے۔ یہ شاہ برہان الدین جانم کے اشعار ہیں۔ اس لیے قیاس ہوتا ہے کہ اگر کاتب نے لوح اور ترقیمہ میں شاہ برہان الدین راز الٰہی کا نام لکھ دیا ہے تو اس نے یا کسی پڑھنے والے نے نام کا اضافہ کر دیا ہے تو اس نے شاہ برہان الدین جانم کو شاہ برہان الدین راز الٰہی سمجھا اور انھیں سے رسالے کو منسوب کر دیا۔

اب یہ سوال حل طلب رہ جاتا ہے کہ اس رسالے کا مصنف شاہ معظم اور علی پیر میں سے کون ہے۔ کتب خانۂ نواب سالار جنگ کا وہ مجموعۂ رسائل جس میں وجود العارفین شامل ہے، قدیم ہے اور اس میں صرف شاہ معظم کے رسائل ہیں، اس لیے قیاس کہتا ہے کہ شاہ معظم کے خاندان یا سلسلے ہی کے کسی فرد نے اپنے بزرگِ سلسلہ کے رسائل کو محفوظ کرنے کی غرض سے یہ مجموعہ مرتب کیا تھا۔ اس لیے ایک ایسے مجموعے میں کسی اور مصنف کے رسالے کو شامل کرنے کا بہ ظاہر کوئی قرینہ نہیں معلوم ہوتا۔

وجود العارفین شاہ معظم ہی کی تصنیف ہوگی اس لیے اس کو گلزارِ چشت، شجرۃ الاتقیا، آزاد نامہ وغیرہ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے، لیکن اس قیاس کو وہ قطعہ کم زور کر دیتا ہے جس میں علی تخلص ہے۔ اس بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اصل رسالہ فارسی میں ہوگا، جس کا شاہ معظم نے دکھنی میں ترجمہ کیا اور متن کے ساتھ علی پیر نے جو قطعہ فارسی میں کہا تھا اس کا بھی ترجمہ کر دیا۔ اور علی پیر کے تخلص کو اسی طرح برقرار رکھا۔ چوں کہ اصل رسالے (فارسی) کے مصنف علی پیر ہیں، اس لیے دکھنی ترجمے کے نسخوں پر بھی انھیں کا نام لکھ دیا گیا ہے۔ اس قیاس کے دو اسباب ہیں:

(۱) نصیر الدین ہاشمی نے نسخہ نمبر ۴۵ شاملات کتب خانۂ آصفیہ کو ترجمہ وجود العارفین



بتایا ہے۔

(۲) مولانا علاء الدین جنیدی سجادہ نشین روضۂ شیخ گلبرگہ کا بیان ہے کہ اُن کے ہاں علی پیر کی تصنیف وجود العارفین کا ایک فارسی نسخہ تھا جو کہیں گم ہوگیا۔ اگرچہ راقم الحروف کی نظر سے فارسی رسالہ نہیں گزرا، لیکن مولانا علاء الدین کا مجرد بیان بھی اہمیت رکھتا ہے۔ اس لیے یہ نتیجہ اخذ کرنے کی گنجائش نکل آتی ہے کہ علی پیر نے وجود العارفین کے نام سے ایک رسالہ فارسی میں تصنیف کیا تھا، جس کا ترجمہ شاہ معظم نے کیا ہوگا۔ لیکن یہ محض قیاس ہے، معظم کا نام کسی نسخے پر درج نہیں ہے، اس کے برخلاف علی پیر کا نام تین نسخوں پر لکھا ہوا ہے۔ پھر اس قطعے کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جس میں رسالے کا نام اور مصنف یعنی علی پیر کا تخلص (علی) موجود ہے۔ یہ ایک ایسی قوی داخلی شہادت ہے جس کی بنیاد پر علی پیر ہی اس رسالے کے مصنف قرار پاتے ہیں۔

زیرِ نظر رسالے کے کسی نسخے پر اس کا نام ترجمۂ وجود العارفین نہیں ملتا۔ پتا نہیں نسخہ نمبر ۴۵ تصوف شاملات کو ہاشمی صاحب نے کیوں ترجمہ وجود العارفین کا نام دیا ہے، جب کہ ترقیمے میں اس کا نام صاف طور پر وجود العارفین لکھا ہے۔

اس رسالے میں مراتب وجود اور اُن کے لوازم و شرائط کی توضیح و تشریح انتہائی جامع اور مرتب انداز میں کی گئی ہے اور اس ضمن میں جو نکات اور اسرار آ گئے ہیں اُن کو بھی سلجھے ہوئے ڈھنگ سے سمجھایا گیا ہے۔ یوں تو دکھن میں تصوف کے موضوع پر سیکڑوں رسائل لکھے گئے لیکن زیرِ تبصرہ رسالہ شیخ محمود خوش دہاں کے رسالۂ معرفت السلوک کے بعد ربط و تسلسل، ایجاز و اختصار، ترتیب و توازن اور جامعیت کی وجہ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

معرفت السلوک یقیناً وجود العارفین کے مصنف کے پیش نظر رہی ہوگی، لیکن اس کو معرفت السلوک کا خلاصہ یا چربہ نہیں کہا جا سکتا۔ اس لیے کہ:

(۱) اس رسالے میں مراتب کے لوازم و شرائط کی جو تشریحات ملتی ہیں وہ بڑی حد تک حضرت امین کے رسائل سے ماخوذ معلوم ہوتی ہیں۔

(۲) مراتب کی تفصیل تو وہی ہے لیکن لوازم و شرائط کی ترتیب میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ معرفت السلوک میں ہر مرتبے کے لوازم کے بیان کا آغاز "موکل" سے ہوتا ہے لیکن وجود العارفین میں ابتدا "راہ" سے ہوتی ہے۔ حضرت امین کے ہاں بھی آغاز اسی طرح ہوتا ہے۔

معرفت السلوک میں مراتب کے لوازم و شرائط کے سلسلے میں "پردہ" کا ذکر نہیں ملتا۔ وجود العارفین میں ہر مرتبے کے ساتھ ایک پردے کو متعلق کیا گیا ہے۔

معرفت السلوک اور وجود العارفین میں لوازم اور شرائط کی ترتیب کا فرق حسبِ ذیل نقشے سے واضح ہوگا۔

| | ۱ | ۲ | ۳ | ۴ | ۵ | ۶ | ۷ | ۸ | ۹ | ۱۰ | ۱۱ | ۱۲ | ۱۳ |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|
| معرفت السلوک | | موکل | دین | قلب | نفس | فہم | توحید | راہ | ذکر | منزل | شہادت | شغل | |
| وجود العارفین | مقام | راہ | ذکر | قلب | دین | نفس | عقل | موکل | شہادت | منزل | توحید | پردہ | شغل |

معرفت السلوک اور وجود العارفین کے تقابلی مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ محمود خوش دہاں نے اپنے پیر کا سلوک بیان کیا ہے اور وجود العارفین کے مصنف نے سلوک برہانی کی اس بدلی ہوئی یا دوسرے الفاظ میں ترقی یافتہ شکل کو پیش کیا ہے، جو حضرت امین کے تصوف اور اجتہاد کے بعد خانوادۂ امینیہ میں رائج ہوگئی تھی۔ اگر وجود العارفین کے مصنف نے شیخ محمود خوش دہاں کی طرح تفصیل سے کام لیا ہوتا تو حضرت امین کے اجتہاد کے وہ تمام پہلو اجاگر ہو جاتے، جن کی تاویل و تشریح کے لیے کسی مستند ماخذ کی عدم موجودگی میں تحقیقی کام کرنے والے کو غیر معمولی دل سوزی اور جگر کاوی کرنی پڑتی ہے۔



# سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ — حیات اور کارنامے کے بارے میں چند رائیں

مولانا زین العابدین سجّاد میرٹھی

..... مصنف نے اپنی پوری صلاحیتِ تحقیق و تنقید صرف کردی ہے۔ چناں چہ حضرت امین کا نام مختلف سوابق اور لواحق کے ساتھ (۵۳) ماخذ سے نقل کیا گیا ہے اسی طرح حضرت میراں جی کے نسب کے سلسلے میں، اس بحث پر کہ وہ نسباً سید تھے یا مغل پوری دادِ تحقیق دی گئی ہے۔ شاہ برہان الدین جانم کے سنہ وفات کے سلسلے میں بھی تحقیق کا حق ادا کیا گیا ہے۔

باب سوم میں حضرت امین اور اُن کے خانوادے کے نظامِ تصوف پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ نظامِ تصوف دوسرے خانوادوں کے نظام کے برخلاف ہندو فلسفے کی بنیاد پر قائم ہے مصنفِ فاضل نے اس کی مخصوص اصطلاحات اور اُن کے معانی اور مفاہیم کو بڑی خوبی سے نقشے کھینچ کھینچ کر واضح کیا ہے۔ حضرت امین نے اس سلسلے میں جو اجتہادات و مفردات کیے ان پر بھی روشنی ڈالی ہے اور حق یہ ہے کہ اس باب میں تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔

کتاب کا بابِ چہارم و پنجم حضرت امین علی اعلیٰ کی تصنیفاتِ نظم و نثر پر مشتمل ہے۔ ان ابواب میں ہر ہر تصنیف کو موضوعِ فکر و بحث بنا کر اس پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس کے مخطوطات یا مطبوعات، جن جن کتب خانوں میں ملتے ہیں، ان کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ اُن نسخوں کے فروق و اختلافات کو واضح کیا گیا ہے۔ الحاقات اور اغلاط کی نشان دہی کی گئی ہے۔ جن رسائل کا انتساب مشتبہ یا غلط قرار دیا ہے اُس کے شواہد

قرائن بیان کیے ہیں اور اس سلسلے میں بڑی دقیقہ سنجی و ژرف نگاہی سے کام لیا ہے۔

پانچواں باب مطالعۂ زبان پر مشتمل ہے۔ اس باب میں حضرت امین کی زبان کے تمام پہلوؤں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے اور میراں جی شمس العشاق اور برہان الدین جانم کی زبان سے اُس کا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔ نیز حضرت امین اور اُن کے خانوادے کی زبان کی صرفی و نحوی خصوصیات کا تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے اور اس زمانے کے مروج روزمروں، محاوروں اور اصطلاحات کی فہرستیں درج کی گئی ہیں، جن سے دکھنی اردو کی ترقی، وسعت اور ارتقا کے مختلف مراحل نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں۔

الغرض یہ کتاب ایک طرف سلسلۂ نظامیہ چشتیہ کے ایک نامور بزرگ کے نظریات سلوک و معرفت اور اُس کے طریق دعوت و ارشاد پر روشنی ڈالتی ہے تو دوسری طرف اردو زبان کے دکھنی میں منزل بہ منزل نشو و نما و ارتقا اور وہاں کے بزرگانِ دین کی، اس کی تاسیس و ترقی میں اہم خدمات کی بھی منظر کشی کرتی ہے۔ یوں یہ تصوف و زبان دونوں سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے نہ صرف مطالعے بلکہ حرزِ جاں بنانے کی چیز ہے۔ ہم فاضل مصنف کی اس محققانہ پیش کش کو اردو زبان کے لٹریچر میں ایک قابل قدر اضافہ سمجھتے ہیں۔

(اسلام اور عصر جدید، اکتوبر ۱۹۷۵ء)

### مولانا سید شاہ صبغۃ اللہ بختیاری

جناب ڈاکٹر سید شاہد حسینی (حسینی شاہد) ..... نے بڑی جد و جہد کے بعد ایک ایسی ضخیم و فخیم کتاب لکھ ڈالی ہے، جو اردو زبان کے ادبی تاریخی لٹریچر میں اپنی نظیر نہیں رکھتی پھر اس کے ذریعے تصوف اور اہلِ تصوف کی خالص اور بے لوث خدمت انجام دی ہے (ادب اور تصوف) دونوں چیزوں کا ذوق رکھنے والوں کے لیے یہ ایک نادر تحفہ ہے۔

جناب شاہد صاحب کا اصل موضوع تو ..... حضرت سید شاہ امین الدین حسینی چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی ادبی خدمات کا تفصیلی تذکرہ اور اس پر مفصل تبصرہ اور اس کی حقیقت کو



اُجاگر کرنا ہے مگر اس دور میں تصوف پر جو کچھ لکھا گیا ہے اور کہا گیا ہے اُس کا فنی جائزہ لینے کے لئے ضروری تھا کہ تصوف کے اس خاص منہاج کو پیش نظر رکھا جائے، جس میں خصوصی تفرد اور انفرادی اجتہاد کو دخل تھا، اس لئے شاہد صاحب نے پوری شہادت دی اور تفصیل سے شاہ امین الدین کے تصوف پر روشنی ڈالی ہے، تب کہیں جاکر ادبی اور لسانی خدمت کا بھی صحیح اندازہ ہوسکا ہے۔

جناب شاہد صاحب نے اپنی کد و کاوش اور سعی جمیل سے ادب اور تصوف دونوں کی اعلیٰ خدمت انجام دی ہے، یہ ان کے خاندانی اور نفسیاتی مزاج سے ہم آہنگ ہے۔ (ان کا یہ کام) ادبیات کی دنیا میں غیر فانی کارنامہ ثابت ہوگا۔

(صفیر (ویلور) اگست ۱۹۷۶ء)

### پروفیسر محمد حسن

رسمی تحقیق سے آگے قدم بڑھاکر تصورات اور طرزِ ادا کے مطالعے سے نتیجے نکالنے کی ابتدا ڈاکٹر حفیظ قتیل نے کی، جن کی کتاب "معراج العاشقین کا مصنف" اس اعتبار سے سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے۔ ڈاکٹر حسینی شاہد نے اس طرزِ تحقیق و تنقید کو گویا بلوغت تک پہنچادیا۔

یہ مقالہ یوں تو چھ ابواب پر مشتمل ہے، لیکن ان چھ ابواب میں امین الدین علی اعلیٰ کے کارناموں کی سبھی جہتوں کا احاطہ ہی نہیں کیا گیا ہے، بلکہ دکنی ادب کی ایک خاص منزل کی تمام خصوصیات کو بھی اجاگر کردیا ہے، مثلاً: تصوف، نثر اور مطالعۂ زبان کے ابواب گویا مسئلے کے سبھی پہلوؤں پر حاوی ہیں۔

حالاتِ زندگی اور خاندان پر جو باب لکھا گیا ہے، اُس سے مصنف کی بے پناہ محنت اور تحقیقی مزاج کا اندازہ ہوتا ہے۔ دکنی ادب کے مشاہیر اور اُن کی تصانیف کے بارے میں بہت سے مفروضات صرف اس باب ہی سے شکست ہوجاتے ہیں۔ آگے

کے ابواب کے انکشافات تو اور بھی حیران کن اور مفید ہیں اور ادبی تاریخ میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں ـــــــــ تصوف پر ڈاکٹر حسینی شاہد کی بحث نہایت اہم اور دل چسپ ہے۔ اس قدر اہم کہ اس کی اہمیت تاریخ ساز ہے۔

پانچ عناصر اور پچیس گن والے تصوف کو ڈاکٹر حسینی شاہد نے شاہ امین الدین علی اعلیٰ کے تصوف کی خصوصیت قرار دیا ہے۔ اور چوں کہ گیسو دراز بندہ نواز سے منسوب رسالۂ معراج العاشقین میں بھی یہی فلسفہ پیش کیا گیا ہے، اس بنا پر اس رسالے کو انھوں نے ڈاکٹر حفیظ قتیل سے اتفاق کرتے ہوئے خاندانِ امینیہ کے ایک بزرگ کی تصنیف قرار دیا ہے ـــــــــ پانچ عناصر اور پچیس گن کا پورا فلسفہ بڑی خوبی اور وضاحت سے سمجھایا گیا ہے اور وہ اس پر صاف دلالت کرتا ہے کہ اس دور کا اسلامی تصوف، ہندو تصوّف سے نہ صرف متاثر تھا بلکہ تہذیبی اختلاط کا جو عمل جاری تھا، اس کا مظہر بھی تھا اور وسیلہ بھی۔

ڈاکٹر حسینی شاہد کا ایک کارنامہ مطالعۂ زبان والا باب ہے۔ اور اس میں بھی خصوصیت کے ساتھ گجری کے اثر کی نشان دہی والا حصہ۔ اب تک گجری پر تفصیل اور وضاحت سے نہیں لکھا گیا۔ "علی گڑھ تاریخ ادب" میں بھی جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ سرسری اور سطحی ہے۔

ڈاکٹر حسینی شاہد لائقِ مبارک باد ہیں کہ ان کی محنت اور دیدہ ریزی سے اردو ادب کی تاریخ کے ایک اہم دور پر روشنی پڑی اور ان کی کاوش نے ادبی تاریخ میں اہم اضافے کا درجہ پایا۔

(عصری ادب : ۱۹۔ ۲۰، ۱۹۷۵ء)

## ڈاکٹر خلیق انجم

ہمیں حسینی شاہد کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ انھوں نے اعلیٰ کو اپنا موضوعِ تحقیق بنا کر تاریخِ ادبِ اردو میں ایک مستقل باب کا اس طرح اضافہ کیا ہے کہ اب کوئی مورخ یا نقاد اعلیٰ کی ادبی فتوحات سے سرسری نہیں گزر سکتا۔



امین الدین علی اعلیٰ جیسے صاحبِ کمال اور صاحبِ علم بزرگ کے سنہ ولادت اور سنہ وفات کا ابھی تک تعیّن نہیں ہوا تھا۔ یہ کام شاہد صاحب نے کیا ہے۔

شاہد صاحب کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اعلیٰ کی تمام تصانیف کے ان مخطوطات کی نشان دہی کی ہے جو مختلف لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔

یہ کتاب صرف اس موضوع پر ہی نہیں بلکہ دکنی ادب پر شائع ہونے والی تمام کتابوں میں سرفہرست ہے۔ شاہد صاحب نے بے شمار قلمی اور مطبوعہ کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔ ان کی جاں فشانی اور دیدہ ریزی نے دکنی ادب میں ایک نیا معیار قائم کیا ہے۔

(ہماری زبان، یکم فروری ۱۹۷۵ء)

## ڈاکٹر راج بہادر گوڑ

بڑی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر حسینی شاہد نے اپنے پیش رو محققین کے کاموں سے جی کھول کر استفادہ کیا ہے، لیکن انھیں خوب پرکھا ہے۔ تحقیق کی کسوٹی پر کسا ہے، رعب میں آ کر انھیں غلطیوں سمیت قبول کرنے سے انکار کیا ہے۔ یہ علمی تجسس، تحقیقی پاکیزگی اور ادبی دیانت داری کا تقاضا تھا، جسے پورا کیا ہے، کئی پرانے بُت توڑے ہیں، نئی حقیقتوں کی روشنی میں، جو حسینی شاہد کی تحقیق اور جستجو سے بے نقاب ہوئی ہیں، ان کے پیش رووں کے اخذ کیے ہوئے کئی نتائج غلط ثابت ہوئے ہیں اور اسے انھوں نے بڑی جرات سے بیان کیا ہے۔

غرض ۶ سو صفحات کا یہ مقالہ ڈاکٹر حسینی شاہد کا ایک زبردست کارنامہ ہے۔ انھوں نے ہماری تاریخ کے ایک درخشاں اور اردو کے دکنی ادب کے ایک عظیم الشان ورثے کو کاغذی پیرہن دے کر زندۂ جاوید کر دیا۔

(سیاست، یکم جولائی ۱۹۷۴ء)

# غلط نامہ

| صفحہ | سطر | غلط | صحیح |
|---|---|---|---|
| ٣ | ٩ | مغتاح الاسرار | مفتاح الاسرار |
| ٧ | ١۴ | بعضوں کے بیانات متناتص اور متضار ہیں۔ | بعضوں کے بیانات متناقص اور متضاد ہیں۔ |
| ٨ | ١٣ | قران | قرآن — بعض اور اشعار میں بھی کتابت کی یہ غلطی رہ گئی ہے۔ |
| ١٢ | ١۵ | اس عہدِ آفریں | اس عہد آفریں |
| ١٨ | ٦ | کہنہ | گہنہ |
| ١٩ | ۵ | نباڈا | نباڑا |
| ٢٢ | ١٠ | کدہیں | کدھیں |
| ٢٢ | ١١ | جب مولا | حُبّ مولا |
| ٢٣ | ١ | جس سے عرفانِ ذات رصالِ حق | جس سے عرفانِ ذات اور وصالِ حق |
| ٢٣ | ۴ | لشہادت | والشہادت |
| ٢٩ | ١٧ | ان کی | اس کی |
| ٣٣ | ٦ | حعنا | قضا |
| ٣٣ | ٧ | مشورہ سے | مشورہ ہے |
| ٣٩ | ۴ | لے | کے |
| ٣٩ | فٹ نوٹ | سات حرف | سات حروف |
| | | یوسات حرف | یوسات حرف |
| ۴١ | ۴ | سے | مئے |
| ۴٢ | ٢١ | مسلے | مسئلے |
| ۴٣ | ٢١ | کرتے ہوتے | کرتے ہوئے |
| ۴۵ | ۴ | جسی | جس |
| ۴٩ | ۵ | ہی رہی | بنی رہی |
| ۵٠ | ۵ | مرار | مراد |
| ۵١ | ١۴ | سب | حسب |
| ۵٢ | ١۴ | آرے | آوے |
| ۵٣ | فٹ نوٹ | سد | ہند |
| ۵۴ | ٩ | ولے | وے |
| ۵۵ | ١۵ | افسر سدیقی | افسر صدیقی |
| ۵٦ | ١٦ | زمانے میں گزرے | زمانے میں گزرے ہیں |
| ۵٧ | ١٣ | لعد | بعد |
| ٦٠ | ٦ | ہیں | آپیں دیتا |
| | | بندھارا | بندھارا |

| صفحہ | سطر | غلط | صحیح |
|---|---|---|---|
| ٦٠ | ١٠ | جر | جو |
| ٦٠ | ١٢ | حق کو | حق کر |
| ٦٠ | ١۵ | خرانا | خزانا |
| | | بات | ہات |
| ٦٦ | ١١ | نازی | تازی |
| ٧٦ | ٢٠ | اپنے اس تردہ | اپنے اس تردد |
| ١٢٦ | ٢ | سبر | سیر |
| ١٣٣ | فٹ نوٹ ١ | عثمان ہاروی | عثمان ہارونی |
| ١۵٨ | ٢ | خلافت | خلافت |
| ١۵٨ | فٹ نوٹ ٢ | ہجری کی | ہجری، جس کی |
| ١٦٣ | ١٨ | عصمت | عظمت |
| ١٧٢ | فٹ نوٹ ٦ | نسل کو تمام | نسل کو قائم |
| ١٧٣ | فٹ نوٹ ١ | خانہ حودرا | خانۂ خودرا |
| ١٧۴ | ١١ | علی پیر کی طرح | علی پیر کی مدح |
| ١٧٧ | ٢ | گزرری تھی | گزر رہی تھی |
| ١٧٧ | ٧ | نورانی مالے | نورانی ہالے |
| ١٧٨ | فٹ نوٹ ٣ | حفیظ قتبل نے | حفیظ قتیل نے |
| ١٨٦ | ١٢ | بادشاہ حوباں | بادشاہِ خوباں |
| ١٨٧ | ۵ | گل مدن | گل بدن |
| ١٨٧ | ٦ | یرفتہ | یرفتنہ |
| ١٩۵ | ٨ | اس کی | ان کی |
| ٢٢٠ | ٧ | زور | روز |
| ٢٢١ | ١٣ | چشماں موا | چشماں ہوا |

بیجاپور کا ایک صوفی شاعر

# شاہ معظم



ڈاکٹر حسینی شاہد



انجمن ترقی اردو، آندھرا پردیش
حیدرآباد

نہ تھے، صرف تخلص سے متعارف تھے۔

شاہ معظم کے کلام کے تفصیلی مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ معظم اُن کا لقب ہے اور عطائے پیر:

خود قادر پیار کیا ہے ٭ مجہ روبیت آپ دیا ہے
مجہ راکھا ناؤں معظم ٭ اور اپنا کیتا محرم

(مفتاح الاسرار)

میرا معظم ناؤں رکھ، عالم پو یوں ظاہر کیا
قادر بڑا داتار ہے پھر کیا کرے گا دیکھنا

(دیوان)

قادر ہے نام شہ کا، کیا اسم ہے مسمیٰ
کر مجھ کو پنج ہزاری معظم دیا لقب

(دیوان)

کہیں کہیں وہ اپنے آپ کو سلطان معظم بھی کہتے ہیں:

یو نامہ کیا کر مجھے حق دیا ٭ مجھ عاجز کو سلطان معظم کیا

(معراج نامہ)

اپ تاج فقر کا دیتا ٭ اور سلطان معظم کیتا

(مفتاح الاسرار)

غالباً ان کا پورا لقب سلطان معظم ہے۔

شاہ معظم کی شرحِ شکار نامہ کا ایک نسخہ کتب خانۂ آصفیہ میں محفوظ ہے۔ جس سے پتا چلتا ہے کہ، ان کا نام محمد حسینی ہے، وہ قادری تھے، چشتیہ گھرانے



میں طالب ہوئے اور حضرت امین کے تربیت یافتہ تھے۔

اس شکار نامے کی شرح فقیر محمد حسینی معظم قادری اپنے حوصلے موافق فرمائے ہیں، اس واسطے کے یو عاجز اس گھر چشت میں طالب ہوا ہے، ہور امین الدین علی خود کوں سجدہ کیا ہے، اون کے تصدق سوں یو فقیر اس راز کوں پونچا ہے[1]

اپنی نسبتِ قادریہ کی طرف انھوں نے گلزارِ چشت میں بھی اشارہ کیا ہے:

معظم کتے قادری ہے فقیر ٭ گناہ گار، عاجز، فقیر و حقیر

لیکن یہ پتا نہیں چلتا کہ خانوادۂ قادریہ میں وہ کس سے بیعت تھے۔ اس بارے میں نہ تو خود انھوں نے کچھ کہا ہے اور نہ کوئی داخلی یا خارجی شہادت ہی ایسی ملی ہے، جس کی بنیاد پر ہم کوئی رائے قائم کر سکیں۔ البتہ چشتیہ گھرانے میں بیعت اور اپنے پیر اور دادا پیر کا ذکر واضح الفاظ میں کئی جگہ کیا ہے، لیکن اس کے باوجود اہلِ تحقیق کے بیانات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعضوں نے انھیں حضرت امین الدین علی اعلیٰ[2] کا اور بعضوں نے حضرت امین کے خلیفہ حضرت عبدالقادر لنگ بند[3] (قادر لنگا) کا مرید، شاگرد بتایا ہے۔ بعضوں کے بیانات متناقض اور متضاد ہیں[4]

[1] مخطوطہ نمبر (۲۱۱۶ جدید) کتب خانۂ آصفیہ، حیدرآباد
[2] ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، اردو نثر کا آغاز اور ارتقا، صفحہ ۱۹۲۔ ابو نصر خالدی، قدیم اردو، جلد اول، صفحہ ۲۲۲
[3] سخاوت مرزا، تاریخ ادب اردو، جلد اول، صفحہ ۴۲۸
[4] ڈاکٹر زور، فہرست مخطوطات ادارۂ ادبیات اردو، جلد اول، صفحہ ۱۴۸ اور صفحہ ۲۶۵، دکنی ادب کی تاریخ، صفحہ ۶۰
نصیر الدین ہاشمی، کتب خانۂ نواب سالار جنگ کی اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست صفحہ ۱۹۹، اور صفحہ ۳۴۸، فہرست مخطوطات کتب خانۂ آصفیہ، جلد دوم، صفحہ ۲۹۰۔ دکن میں اردو پنجم اشاعت، صفحہ ۲۴۹، علی گڑھ تاریخ ادب اردو صفحہ ۳۲۱